انشائیہ
عبدالماجد
دریابادی

حصہ دوم

چند ادبی نوشتوں کا مجموعہ

نظر ثانی، ترمیم، اضافہ کے بعد

۱۹۷۹ء

عبدالماجد دریابادی

مصنفہ "مقالات ماجد جلد اول" "تفسیر القرآن" (اردو و انگریزی)

ایڈیٹر "صدق" لکھنؤ

قیمت

پانچ روپیہ پچاس پیسے

ناشر

نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلی فون نمبر ——— ۲۴۵۵۶

ناشر، عزیز الرحمٰن　　بار دوم اگست ۱۹۶۲ء　　پرنٹر، شاہی پریس لکھنؤ

فہرست مضامین

عرضِ حال

خدا کی شان! ایک کم سواد و بے استعداد قصباتی، دیہاتی کو بھی اس کا حوصلہ کہ اپنا نام ادیبوں انشاپردازوں کی فہرست میں لکھا جائے اور دل میں یہ ولولہ کہ زبان وادب کی خدمت کرنے والوں کی صف (وہ صف آخر سہی) میں جگہ پائے!

اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے!

اسرائیلیوں کی زبان میں "لوسنو، میاں طالوت کا شمار بھی پیغمبروں میں ہونے لگا"[1]

________ مصر کی غریب ضعیفہ کو بھی یوسف کی خریداری کا شوق چرایا!

اہل فضل کی ذرہ نوازی، دوستوں کی بے جا مدح وحوصلہ افزائی اور پھر اپنا ذوق نمائش مل ملاکر جو کچھ بھی گزرے تھوڑا ہے۔ پرانے اور نئے، چھوٹے اور بڑے ایسے مضمون جن میں کچھ نہ کچھ مناسبت زبان وادب سے ہو رائے یہ ٹھہری کہ یکجا کرلئے جائیں۔ بعض ان میں کے حال کے ہیں اور بعض سالہا سال قبل کے۔ قلم کا مذاق اتنے عرصے میں کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اس لئے نظرثانی اور وہ بھی جزئیات کی حد تک قدیم تحریروں پر بھی کرلی گئی ہے کہ طرز وعبارت میں یکسانی کسی درجہ میں تو پیدا ہو ہی جائے مجموعہ کاٹ چھانٹ کے بعد دو جلدوں میں آپایا۔

پہلی جلد چند سال اُدھر پیش ہو چکی اس کے دو ایڈیشن نکل چکے اور وہ بعض یونی ورسٹیوں میں داخل نصاب بھی ہو چکی ہے۔ اس کے عنوانات جلی و

---

[1] اصل فقرہ توریت کا ہے۔ اُردو فقرہ اس سے اپنایا ہوا ہے۔

خفی حسب ذیل تھے۔

(۱) چند مقالے (پیام اکبر۔ اُردو کا ایک بزنام شاعر وغیرہ مضامین)

(۲) چند مقدمے (کلام جوہر۔ سیرت محمد علی۔ مسدس حالی وغیرہ ۱۰ مقدمے)

(۳) چند تبصرے (۱۰ کتابوں اور ایک رسالے پر تبصرے)

دوسری جلد اب حاضر ہے۔ ان دو جلدوں کے علاوہ تیسری جلد کے لئے بھی سامان خاصی حد تک فراہم ہو چکا ہے۔ جو باکمال اس میٹھی پھیکی غذا پر منھ بنائیں گے۔ وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے۔ اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے وہ کرم فرمائی اور صفت ستاری کا نقش دل پر بٹھائیں گے۔ مقام عدل اور مقام فضل دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے اعلیٰ، برتر، خوب تر ہے۔!

عفو خواہ

عبدالماجد

سنہ ۱۹۶۱ء

سنہ ۱۳۸۰ھ

دریاباد بارہ بنکی

۱
چند مقالے

(۱)

مرزا رسوا کے قصے
کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے[۱]

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات — تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
جس نے موت کو دعوت ان الفاظ میں ۱۳۱ ، ۲۳ سال قبل دی تھی اس کی شمع حیات واقعۃً اکتوبر ۱۹۳۱ء میں گل ہو کر رہی۔ موت کو جب آنا ہوتا ہے جب ہی آ کر رہتی ہے۔ شاعر کی طبیعت ممکن ہے حیات سے اسی وقت سیر ہو چکی ہو لیکن خود حیات اس وقت شاعر سے سیر نہیں ہوئی تھی موت تو جبھی آئی جب آنے آنا تھا۔ اور جب آئی تو بہتوں نے یہ بھی نہ جانا، کہ کس نام کے رسوا ور شعر و ادب کے رسیا کو اپنے ہمراہ لیتی گئی! سدا رہے نام اللہ۔ بقا نہ کسی شاعر کو ہے نہ شاعری کو، نہ ادب کو، نہ ادیب کو، کیسے کیسے افسانہ گو اور افسانہ نویس آئے اور کیسی کیسی فریدار کہانیاں سنانے بیٹھے مگر، ہا! دیکھتے ہی دیکھتے خود انھیں کی زندگی افسانہ بن گئی! باقی رہنے والا بس جو ہے، وہی ہے۔

---

[۱] تحریر ۱۹۳۱ء ۔ نظرثانی ۱۹۵۳ء

ذاتِ معبود جاودانی ہے ۔ باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

جو رونق محفل ہوتے ہیں وہ ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں محفل کی رونق جوں کی توں! لسان العصر اکبرؔ کے الفاظ میں ؎

دنیا یونہی ناشادیوں میں شاد رہے گی ۔ برباد کیے جائے گی، آباد رہے گی

ناول نویسی کی عمر اُردو میں مرزا رسوا کی عمر سے بڑی ہے سرشار اور شرر اور دوسرے حضرات اپنے اپنے رنگ میں اس چمن کا غذی کی آبیاری شروع کر چکے تھے کہنا چاہئے کہ انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں اور آٹھویں دہے ہیں انگریزی ناول بھی اُردو میں خاصی تعداد میں منتقل ہو چکے تھے جب کہیں جاکر مرزا محمد ہادی مرزا لکھنوی بی۔ اے نے انیسویں صدی کے نویں دہے میں اس کوچہ میں قدم رکھا۔ آدمی پڑھے لکھے صاحب علم۔ شریف خاندان تھے۔ شمار شہر کے متین و ثقہ طبقہ اور اہل علم میں تھا ناول نویسی کا مشغلہ اس وقت تک کچھ ایسا معزز نہ تھا، غرض کچھ وضع قدیم کا پاس، کچھ اپنے علمی وقار کا لحاظ، داستان سرائی کرنے بیٹھے تو چہرہ پر "مرزا رسوا" کا نقاب ڈال لیا، حالانکہ یہ نقاب تھا اتنا باریک کہ جو چاہے وہ ایک ایک خط و خال ایک ایک بال باہر سے گن لے۔ اُردو میں ناول بہتیرں نے لکھے اچھے اچھوں نے لکھے۔ پر اُن کا رنگ سب سے الگ۔ ان کا انداز سب سے جدا، نہ اُن کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں" نہ ان کی زبان میں غرابت زائیاں" نہ اُن کے اوراق میں "برق پیمائیاں" اور نہ "کوہ تراشیاں" نہ ان کے الفاظ میں "نرم ریزی" نہ ان کی ترکیبیں "ارتعاش انگیز" نہ ان کی تصویر رزم میں "برق پاشیاں" نہ ان کی داستان بزم میں "اجسام آرائیاں"۔ پلاٹ وہی روزمرہ صبح و شام کے پیش آنے والے واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہیں۔ زبان وہی گھر اور باہر کی ہر

اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصہ کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو، نہ برلن نہ ٹوکیو۔ بس یہی لکھنؤ و فیض آباد، نہ دہلی و الہ آباد۔ افسانے کے اشخاص نہ لنڈھور نہ سندباد نہ تاج الملوک نہ ملکۂ زرنگار بس یہی حکیم صاحب اور شاہ صاحب راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب اور مرزا صاحب۔ عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا نیک قدم۔ کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے اس کی نسل آگے نہیں چلتی اپنے طرز کا موجد بھی وہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی۔ مرزا رسوا کا بھی کوئی خلف معنوی آج تک نہ پیدا ہوا۔

پیش رو اکثر اور معاصرین بیشتر تکلفات میں الجھ کر رہ گئے۔ رسوا تصنع سے پاک اور آورد سے بے نیاز۔ ابھی ہنسا رہے ہیں، ابھی رلانے لگے۔ مزاح و گداز، سوز و ساز، شوخی و متانت سبھی اپنے اپنے موقع سے موجود، لیکن آمد و بے ساختگی ہر حال میں رفیق۔ شستگی و روانی ہر گوشۂ بساط میں قلم کی شریک! جو منظر جہاں کہیں کا دکھایا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرصع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا ہے ہر نقل پر اصل کا گمان، ہر عرض میں جوہر کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکا الفاظ کے پردہ میں حقیقت کا جلوہ۔

ناول بہر حال ناول ہی ہوتے ہیں۔ اخلاق کے مسائل اور تصوف کے مقالات نہیں ہوتے۔ اور پھر ناول بھی وہ جو نہ تاریخی ہوں نہ اصلاحی "شریف زادہ" کو چھوڑ کر جسے ناول کہنا بھی درست نہیں باقی ناولوں امراؤ جان، ذات شریف افشائے راز اور اختری بیگم کا پلاٹ تمام تر معاشی و خانگی ہی ہے۔ اور ناول میں بجز حسن و عشق کے مضامین، اور ہجر و وصل کی داستانوں کے اور رہتا کیا ہے؟ خیال ہوتا ہوگا کہ ان ناولوں میں نوجوانوں کے لبھانے اور نوعمروں کے جذبات نفسانی کے بھڑکانے کا سامان افراط سے موجود ہوگا۔ لیکن توبہ کیجئے فحش عریانی الگ

رہی رکاکت و ابتذال بھی کہیں آنے نہیں پایا اور کہیں وہ ایک جگہ جہاں صحیح مصوری اور سچی عکاسی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا وہاں بھی انداز بیان زیادہ سے زیادہ لطیف اشارہ و کنایہ کا رکھا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں کوئی گندی نالی پڑ گئی ہے اور آپ ہیں کہ رومال ناک سے لگائے لپ جھپ لمبے لمبے ڈگ رکھتے اس سے گزرے چلے جا رہے ہیں۔ تقریباً ہر افسانہ شریف گھرانوں میں بار پانے کے قابل، پڑھتے جائیے اور حیات بشری میں درک و بصیرت حاصل کرتے جائیے۔ آپ ادھر افسانہ کی لذت میں محور ہیں گے اور ادھر عبرت و ہدایت کے گھونٹ بلا تکلف حلق سے اترتے چلے جائیں گے۔ کونین کی گولی پر شکر اس طرح چڑھی ہے کہ بڑے بڑے ضدی بچے بھی اسے دیکھ کر پھسل پڑیں اور مچل مچل کر اس کی طرف لپکیں۔ ناصح کی تلخ نوائیوں کا رونا سب روتے آئے ہیں۔ یہاں حضرت ناصح گھل مل کر راز دار بن جاتے ہیں اور چپکے چپکے گوشوں میں سب کچھ کہہ سن ڈالتے ہیں ــــ کیا مولی کی کری اور کارسازی ہے غالب نے کہا تھا کہ ؎

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

یہاں "ہادی" "رسوا" ہو کر بھی ہادی ہی بنا رہا!

مشاعرے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے ایک مشاعرہ کا نقشہ، مرزا صاحب کا کھینچا ہوا تصور کی آنکھوں سے ملاحظہ فرمائیے!

"گرمیوں کے دن تھے مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علاحدہ کیا گیا تھا کاغذی ہانڈیوں میں سفید پانڈ

کی سات سات گلوریاں سُرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں ڈھکینوں پر تھوڑا تھوڑا اکھانے کا خوشبودار تمبا کو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے چاندنی رات تھی اس لیے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا آٹھ بجتے بجتے سب احباب، میر صاحب، آغا صاحب، خاں صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔"

رسمی انکسار کے بعد شعر سنائے جارہے ہیں اور داد بھی خوب مل رہی ہے اسی انداز سے اور انھیں چچے تلے لفظوں میں جو شاعروں کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں بے تکلف احباب ہیں آپس میں نوک جھونک بھی چلی جارہی ہے۔ کلام سارے کا سارا خود جناب رسوا کا ہے اُسی کو مختلف اصحاب کی زبان سے ادا کرایا ہے، امراؤ جان کا تخلص آدا رکھا ہے کسی صاحب کے مقطع میں مخمور باندھا ہے۔ افسانہ گوئی کے وقت اپنے کو رسوا کے پردہ میں چھپاتے تھے شاعری کی دنیا میں اپنا نام مرزا کہہ کر چمکایا ہے خوب خوب شعر نکالے ہیں کچھ ادھر اُدھر سے ملاحظہ ہوں:۔

دل میں کھپ جائیگی قاتل کی ادا ایک نہ ایک   کارگر ہوگا کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

کوئی خوروں پہ فدا کوئی بتوں پر شیدا   ڈھونڈھ ہی لیتا ہے انسان خدا ایک نہ ایک

لطف زبان و لطف مضمون دونوں موجود۔ چھوٹی بحروں میں تو شاعری بہت ہی خوب کی ہے۔

شب فرقت بسر نہیں ہوتی   نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

شور نسریاد تا فلک پہونچا | مگر اس کو خبر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا | زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی | کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی
اب کس امید پر نظر میری | شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر | کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی
اے آوازہم کبھی نہ مانیں گے | دل کو تو دل کی خبر نہیں ہوتی

بعض مشاعروں میں غزل کا ضمیمہ ہزل بھی ہوتی ہے۔ غزل کا نمونہ آپ نے دیکھ لیا۔ متانت بزم اگر اجازت دے تو دو شعر زری ہزل کے بھی سنتے چلئے۔

تمہیں رشک آئے اپنے سے نہیں ہے خیر موبدلا | ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو
یہ کیا خوب دوئی میں نہ وحدت دکھائی ہے اور وحدت سے دوئی نکالی ہو!
کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے | محبت کا مزا آئے اگر معشوق ارذل ہو
کسی عاشق نے کبھی کیوں اتنی شرافت کی یہ کفش کاری کی ہوگی!

یقین ہے کہ نہ ایسے قافیے آپ کے سننے میں آئے ہوں گے نہ مضمون کی یہ نازک خیالیاں!

ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے کہ مرزا صاحب افسانہ نویسوں کے حلقہ میں رسوا تھے اور شاعری کی بزم میں مرزا۔ متعدد نظمیں، مثنویاں وغیرہ افسانوں سے بہت قبل کی لکھی ہوئی ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں ایک مستقل منظوم ڈراما، مرقع لیلیٰ مجنوں، کے نام سے لکھا یہ غالباً پہلی تصنیفی کوشش تھی۔ نومشقی کے آثار جا بجا نظر آرہے ہیں، اور سن بھی یقیناً نوجوانی کا رہا ہوگا پھر بھی کلام بحیثیت مجموعی پختہ اور استادانہ ہے لکھنؤ کی شاعری کا اس وقت عام رنگ کیا تھا؟ اب کس کے منہ میں دانت ہیں

جو اسے صاف صاف بیان کرے۔ مرزا نے آنکھیں جس فضا میں کھولی تھیں اور نشو ونما جس ماحول میں پایا تھا، چاہئے تھا کہ خود بھی آنکھ بند کرکے اسی ڈھرّے پر چل پڑتے لیکن خدا کی قدرت کہ جب محفل کے گرما کے کو اُٹھے تو گل و بلبل، مہندی اور سرمہ، دوپٹہ اور آنچل کے مصنوعی مضامین کی جگہ دل کے جذبات اور قلب کے واردات ہی موزوں ہو کر زبان و دہن سے نکلے ؎

دن رات سیر کرکے سفید و سیاہ کی　　تصویر کھینچتے ہیں تیرے جلوہ گاہ کی

کیا کیا ہے نامۂ اعمال کو سیاہ　　ہم شاعروں کو فکر رہی ہے گناہ کی

میری غزل دلوں پہ نہ کیونکر اثر کرے　　صورت ہے ہو بہو میرے حالِ تباہ کی

لیلیٰ مجنوں کا افسانۂ محبت کسے نہیں معلوم۔ ڈراما میں وہی قصہ منظوم ہے جو عام طور پر زبان زد ہے۔ جابجا اپنی غزلیں بھی سنائے گئے ہیں۔ قصہ کے اجزا کا دہرانا یہاں منظور نہیں، سینکڑوں مرتبہ کے سُنے ہوئے پامال قصہ کے دہرانے میں لطف ہی کیا ہے۔ البتہ مرزا نے آج نہیں آج سے ۵۲ سال قبل جو اصلاح لکھنؤ کے رنگ تغزل میں کر دی تھی ذرا اس پر ایک اچٹتی سی نظر کر لیجئے ؎

بے نوائی ہو مقدر میں تو کیجے عاشقی　　یہ بہانہ خوب ہے ذلت اُٹھانے کے لیے

اپنے صورت گر سے پوچھوں میں اگر مقدور ہو　　کیا بنایا تھا مجھے تو نے مٹانے کے لیے

ہجر کی شب کے بنانے میں بھی تھی اک مصلحت　　طول آخر چاہئے تھا کچھ زمانے کے لیے

کہیں کہیں بے ساختہ اپنے معاصروں کی بولی بھی بول گئے ہیں۔ مثلاً

عشق کا کل یہ وہ سودا ہے کہ جاتا ہی نہیں　　مارے قید سے زنجیر سے کیا ہوتا ہے

کیا سنائیں تھیں افسانۂ ہجر کا کل　　ایسی الجھی ہوئی تقریر سے کیا ہوتا ہے

لیکن عام انداز یہ ہے ؎

۱؎ بمبئی ۱۹۳۲ء

دیکھئے عالم تقدیر سے کیا ہوتا ہے	لاکھ تدبیر ہو تدبیر سے کیا ہوتا ہے
اب سُنا ہے کہ جفا سے بھی پشیماں ہیں وہ	اور پھر آہ کی تاثیر سے کیا ہوتا ہے
گوش مشتاق سخن دل متمنیِ وصال	تو ہی کہہ دے تری تصویر سے کیا ہوتا ہے
کچھ کھٹک سی ہے کلیجہ میں مگر زخم نہیں	کیا بتائیں کہ ترے تیر سے کیا ہوتا ہے

تحفے نثر میں ہوں یا نظم میں، ظرافت اور شوخی اگر ان کی جان نہیں تو ان کے لیے عرض لازم سے کم بھی نہیں بلکہ جو ناٹک اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں ان میں تو کامک کا درجہ کچھ اس سے کبھی بڑھ کر ہوتا ہے اور عاشقانہ مثنویوں میں تو شوخی کے ڈانڈے اکثر عریانی اور فحاشی سے مل مل گئے ہیں۔ مرزا جب ظرافت پر آتے ہیں تو ہنساتے ہی نہیں ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے ہیں۔ ایک بازاری منچلا طرار زنانے اسٹیج پر آتا ہے اور شرم وحیا کا جامہ اُتار اپنے باپ کے سامنے اپنی آشنا خیلا کا نام لیتا ہے اور پھر انھیں والد ماجد سے فرمائش یہ ہوتی ہے کہ اس سے ملوا دیا جائے ! زبان، لب ولہجہ، الفاظ سب کے ٹھاٹھ وہی بازاریت اور لچپن کے ہیں کہتا ہے ؎

مجھے خیلا سے ملوا دے ابے باوا ابے باوا	نہیں تو ہاتھ دھو مجھ سے ابے باوا ابے باوا
میں بیٹا ہوں پھر تیرا نہ تو باوا ہے پھر میرا	جو کی پہلو تہی تو نے ابے باوا ابے باوا

جیسی روح ویسے فرشتے۔ پدر بزرگوار آخر ان کے بھی باپ تھے جناب خونخوار زماں صاحب ایک پدرانہ دم خم کے ساتھ تن کر کھڑے ہوتے ہیں اور اگر پسر نتواند پدر تمام کند کے مصداق جواب اسی زبان میں دیتے ہیں ؎

یہ کیا انداز ہیں تیرے، ابے مردک ابے گرگے	یہ کیسے سیکھے ہیں شیوے ابے مردک ابے گرگے
ابے باوا ابے باوا یہ کیا بکتا ہے تو مرغے	ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے

سعادت اطوار بلند اقبال، اکڑ اکڑ کر اپنا فخریہ سناتے ہیں ؎

. . . .   اڑائے خوب کنکوے ابے باوا بے باوا
بڑھایا سات تاری پر تو اکثر تیلی کانی   دیئے نہ ڈور پر مانجھے ابے باوا بے باوا
لڑا امیدواران جب راجہ سے اور نواب ولد اسو   نکالے ہم نے بھی لنگے ابے باوا بے باوا
کبوتر کی ہوا آئی تو لے کر ہاتھ میں چھیپی   اڑائے خوب ہی پٹھے ابے باوا بے باوا
ہوا جب راگ کا لہرا ملے ہم تان تن خاں سو   بڑھائے خوب یارانے ابے باوا بے باوا
ہوا یاروں میں جب بنا چڑیاں ماں کا سب گہنا   اڑائے خوب گلچھرے ابے باوا بے باوا

خونخوار خاں اب پورے خونخوار بنے ہوئے دانت پیس پیس کر گرجتے ہیں ؎

گھرانے کی ڈبائی آبرو کم بخت یوں تو نے   ابے تجھ سے خدا سمجھے ابے مردک ابے گرگے
اڑاتا ہے کبوتر تو لڑاتا ہے بٹیریں تو   ابے او الو کے پٹھے ابے مردک ابے گرگے
ٹھاٹا ہو ہمیں کیوں تو ہمیں کیا کام ہو اس سے   ابے او مرغی کے بچے ابے مردک ابے گرگے
ابے کیا کالا پانی کے تو آیا ہے بھٹی سے   یہ کیسے آتے ہیں بھبکے ابے مردک ابے گرگے
ابے بیٹا ہو تو کس کا غلط ہے یہ تیرا دعویٰ   ہمارا تو نہ ہم تیرے ابے مردک ابے گرگے

اور مصرعہ تو یہ ارشاد ہوا ہے۔؟ ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے

کسی چمن اور سبزہ زار کی سیر کرتے کرتے دفعتہً آپ کے قدم ایک گندی گلی میں آ پڑیں، تو آپ بے اختیار یہی چاہیں گے کہ کہیں جلدی سے اتنا راستہ ختم ہوا اور آپ پھر کھلی ہوئی خوشبودار ہوا سے اپنے مشامِ جان کو معطر کرنے لگیں عجب نہیں کہ اس منظر سے بھی آپ کچھ اسی طرح بیزار ہوئے ہوں۔ لیکن یہ محض آپ کے قدیم مشرقی معیار کا اثر ہے جو ایسے منظر تکلیف دہ نظر آئے۔ اس روئے زمین پر ایسے ایسے ملک بھی آباد ہیں جہاں نہ باپ کا ادب کوئی چیز ہے نہ بزرگوں کا لحاظ۔ بے باکی و بے تمیزی کا نام وہاں کی اصطلاح میں عین آزادی اور آزاد خیالی ہے۔ اور اب

بیسویں صدی عیسوی کا وسطے کر لینے کے بعد خود آپ کا ملک ان منظروں سے نا آشنا کب رہا ہے؟

مرزا صاحب نرے شاعر یا افسانہ نویس نہ تھے۔ فلسفہ و حکمت کے بھی رازدار تھے اور یہ رنگ بھی اُن کا کہیں چھپتا نہیں ہے۔ مثنوی ہو یا غزل، ڈراما ہو یا انشا سب کہیں پھوٹ ہی آتا ہے۔ مجنوں کی حیرانیاں دکھاتے دکھاتے دفعۃً خیال یہ آگیا کہ مجنوں تو مجنوں تھا ہی جو بڑے بڑے ہوشیار اور فرزانۂ روزگار مانے گئے ہیں انھوں نے بھی اس کارخانۂ حیرت کے سمجھنے میں کیسے کیسے غوطے کھائے ہیں یہاں تک کہ بعض بعض تو ایسے بہکے کہ سرے سے صانع عالم ہی کے وجود سے انکار کر بیٹھے ان دانشمندوں کی تردید انھیں کی زبان اور اصطلاحات میں ملاحظہ ہو ؎

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے | وہم ہے یا کہ حقیقت ہو یہ دُنیا کیا ہے
تو یہ کہتا ہو ہیولیٰ کے یہ سب ہیں دھوکے | پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکا ہو یہ دھوکا کیا ہے
پھر کہا تو نے کہ دیکھا نہیں خالق کو کبھی | اِک ذرا غور تو کر جی میں تو کہتا کیا ہے
تو نے دیکھا ہے اگر جی وہ ہیولیٰ کو کبھی | پھر جو قائل ہو تو اس کا تجھے سودا کیا ہے
بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی | تجربہ ہم کو بتا دے کہ بنا تا کیا ہے
مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا | پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے
اس کا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن | پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

مرقع کا خاتمہ لیلیٰ کی موت پر ہوتا ہے۔ وفاداری عاشق کی ضرب المثل ہے لیکن یہاں محبوب بھی پیکر وفا ہے نوجوان لیلیٰ ناشاد و نامراد دنیا سے رخصت ہو رہی ہے، باپ کا محل کا محل کھڑا ہوا ہے اسی محل کے ایک گوشہ میں یہ حسرت نصیب دم توڑ رہی ہے۔ دم واپسیں ہے اور اس وقت یہ بول نو عمر و ناشاد مرنے والی کی زبان سے

نکل رہے ہیں۔

ہم نہیں ان میں جو ہیں موت سے ڈرنیوالے — اس کا کیا غم، یونہی مرجاتے ہیں مرنیوالے
ہے خوشی موت کی خود زیست سے بیزار ہیں ہم — دم ٹھہر جائے تو ہم کب ہیں ٹھہرنیوالے
اب تو ٹھنڈک پڑی جی میں کہ ہوئے ہم برباد — آج تو خوش ہوئے الزام کے دھرنیوالے
لوگ کہے دیتے ہیں، ہم قیس پہ دم دیتے تھے — اب کدھر بیٹھے ہیں رُسوا ہمیں کرنیوالے
پاک الفت تھی ہمیں اس کا خدا عالم ہے — پاک دل ہوتے ہیں اللہ سے ڈرنیوالے
غسلِ میت مجھے دیتا ہے مرا دیدۂ تر — دیکھو اس طرح نکھرتے ہیں نکھرنے والے
اجلا اجلا وہ کفن اور وہ پھولوں کی مہک — مرکے بھی آہ سنورتے ہیں سنورنیوالے

مجنوں دور سہی اس کا تصور تو پاس ہے اس خیالی پیکر سے جو جو وصیتیں ہو رہی ہیں انھیں بھی ذرا دل کڑا کر کے سُن لیجئے ؎

مرے مجنوں کو مرے بعد یہ دینا پیغام — اے محبت میں مری حد سے گزرنیوالے
تجھ پہ لیلیٰ ہوئی قربان تیری جان سے دور — دیکھ یوں بات پہ مرجاتے ہیں مرنیوالے
یوں تو تو کہا کرتا تھا ہم کو اے قیس — تو سلامت رہے اے نام کے دھرنیوالے
حشر کے دن تجھے اللہ سے لیں گے اے قیس — صبر کر صبر کہ یہ دن ہیں گزرنیوالے
تو نہ کڑھنا تجھے میرے غم الفت کی قسم — اس کا کیا غم یونہی مرجاتے ہیں مرنیوالے

مصنف عشق مجازی کا قصہ لکھنے بیٹھا تھا اس کے ختم ہوتے ہی مصنف کو خود اپنے افسانۂ حیات کے انجام کا خیال آجاتا ہے اور آداب افسانہ نگاری بھول بھال بے اختیار ہو ایک ٹھیٹھ مشرقی اور ایک سچے کلمہ گو کی شان سے نظم میں نہیں نثر میں ناظرین سے التجا کرنے لگتا ہے کہ اے ناظرین و الاتمکین میں دعا کرتا ہوں اور تم آمین کہنا کہ جس طرح عشق مجازی میں مجنوں کا انجام ہوا اسی طرح عشق حقیقی میں ہمارا تمھارا خاتمہ بالخیر ہو آمین ثم آمین ــ "ترقی پسند" بالکل معذور ہے اگر وہ ایسے

"مُلّانے" کو ڈراما نویسوں میں ادنیٰ درجہ دینے سے بھی انکار کردے!

لیلیٰ مجنوں پر فاتحہ خیر پڑھیئے ان غریبوں کو صدیاں ہوچکیں مرزا صاحب کا اصلی میدان ماضی نہیں حال تھا، پردیس نہیں دیس تھا۔ لکھنؤ آپ کا خوب دیکھا بھالا ہوا ہے آیئے ایک مرتبہ اس کی سیر مرزا صاحب کی رہنمائی میں کریں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ لکھنؤ ۱۹۵۳ء کا نہیں اس سے ۷۰، ۷۵ سال قبل کا ہے۔ بہر حال اس لکھنؤ کی گلی گلی اُن کی چھانی ہوئی ہے۔ ان سے بہتر رہنما یہاں کی سیر کے لیے کون ملے گا۔ سب سے پہلے ایک حکیم صاحب سے نیاز حاصل کرتے چلئے دیکھا آپ نے بھی انھیں بارہا ہوگا۔ تعارف اب مرزا صاحب کرائے دیتے ہیں۔

"میانہ قد، گندمی رنگ، الفربہ، ناک نقشے میں کسی قدر بھدا پن، گول چہرہ آنکھیں کسی قدر چھوٹی سن شریف چالیس سے کچھ اوپر اس نسبت سے توند کی استدارت اور ضخامت کو بھی قیاس کر لیجئے مگر اپنی صورت شکل پر حد سے زیادہ نازاں تھے۔ اکثر اوقات آئینہ پیش نظر رہتا تھا کسی قدر شریعت مزاج میں تھی اس لیے داڑھی منڈوائی تو نہ جاتی تھی مگر اس قدر باریک کترواتے تھے کہ اگر خوردبین سے دیکھی جائے تو بھی بمشکل نظر آئے۔ موچھوں میں سفید بال اس کثرت سے تھے کہ ان کو چنتے چنتے حجام عاجز آجاتا تھا۔ خضاب کی کئی مرتبہ صلاح دی گئی مگر اس کی نوبت ابھی تک نہ آئی تھی یا تو کوئی مجرب نسخہ دستیاب نہ ہوا تھا یا یہ کہ حکیم صاحب اس کو علامت پیری تصور کرتے تھے اور بالوں کی سفیدی ایک امر عارضی تھا ابھی حکیم صاحب کا سن ہی کیا تھا۔ خوش غلافی میں بھی حکیم صاحب اہتمام مزید فرماتے تھے۔ کپڑوں کی قطع و برید کا بھی اچھا سلیقہ تھا اچھے اچھے درزی ان کے کپڑے بیونتے ہوئے گھبراتے تھے۔ انگرکھا جس کی چوڑی ثقاہت اور بانکپن کی وضع میں

حد فاصل ہو اس تناسب کہ حکیم صاحب سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ یہ سب سامان اس لیے تھا کہ آپ کو مالدار عورتوں کی تیاری کا نہایت شوق تھا۔ آپ کی ہمت مردانہ ہر وقت اس طرف مبذول رہتی تھی کہ کوئی وثیقہ دار بیگم پھنس جائے تاکہ مدت العمر چین سے بسر ہو۔ اکثر جگہ پیغام سلام تھا مگر ابھی تک کوئی سونے کی چڑیا جال میں نہ پھنسی تھی۔"

حلیہ مبارک تو اب غالباً ذہن سے کبھی نہ نکلے لگے ہاتھ جناب حکیم صاحب کے مطب کی بھی زیارت ہوتی چلے اور حکیم صاحب کے احباب اور خدمت گار خاص میاں نبی بخش سے بھی یاد اللہ ہو جائے تو بہتر ہے ایسے موقعے روز نہیں ملا کرتے۔

"ابھی حکیم صاحب گھر سے برآمد ہو کے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں آدمی نے حقہ بھر کے سامنے رکھ دیا ہے حکیم صاحب نے حقہ کے دو ہی ایک کش پئے ہونگے کہ دو صاحب اور اپنے گھروں سے نکل کر بعد معمولی سلام علیک اور مزاج پُرسی کے سامنے مونڈھوں پر آ بیٹھے ان میں سے بھی ایک صاحب کے ہاتھ میں ڈیڑھ خمہ حقہ ہے خوب سلگا ہوا۔

حکیم صاحب۔ میر صاحب واللہ آپ کا حقہ تو اس وقت قیامت کر رہا ہے۔

میر صاحب۔ (حقہ حکیم صاحب کے سامنے لا کے) لیجئے ملاحظہ فرمائیے۔

حکیم صاحب۔ جی تو یوں ہی چاہتا تھا تو پھر (اپنے حقہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ،

میر صاحب۔ مجھے مرحمت ہو۔

حکیم صاحب۔ خدا جانے نبی بخش (خدمت گار) کس طرح حقہ بھرتے ہیں ڈیڑھ پہر ہو گیا ابھی تک سلگا ہی نہیں۔

نبی بخش۔ (زیر لب مسکرا کر) اے حضور ابھی تو بھر کے رکھا ہے بھاری تو ا ہو

سلگتے سلگتے گا لایئے پھونک دوں اگر ایسا ہی جلدی کا شوق ہے تو شلفہ بھروا لیا کیجئے۔ نبی بخش حقہ سے چلم اتار کے چلے ہی تھے میر صاحب نے چلم ہاتھ سے لے لی۔

میر صاحب۔ اب کیا حقہ کو غارت کرو گے دیکھو میں درست کئے دیتا ہوں۔

حکیم صاحب۔ آپ نہ تکلیف فرمایئے درست ہو جائے گا۔ (نبی بخش کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا) نبی بخش پھر چلم لینے کو بڑھے تھے کہ۔

میر صاحب۔ نہیں تم رہنے دو میں درست کر لوں گا۔

داروغہ صاحب۔ (دوسرے صاحب جو ابھی تک چپکے بیٹھے تھے) یہ ممکن نہیں اب میر صاحب چلم کی جان نہ چھوڑیں گے۔

حکیم صاحب۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا شوق حقہ کا ہمارے جناب میر صاحب کو ہے ایسا کبھی کم ہوتا ہے۔

داروغہ صاحب۔ کیوں نہ ہو۔ افیون کے شوق میں جزو اعظم ہے۔

حکیم صاحب۔ اس میں تو شک نہیں افیونی جیسے حقے کے قدر شناس ہوتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا۔

داروغہ صاحب۔ قدر شناس نہ کہئے نبض شناس فرمایئے حقہ کی دیکھ بھال بھی انھیں کے حصہ میں ہے۔

مرزا صاحب۔ (ایک اور صاحب جو ابھی آ کے سامنے داروغہ صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے ہیں) یوں کہئے کہ حقہ کے حق میں مسیحا ہیں۔

میر صاحب۔ اے زندہ باش۔

حکیم صاحب۔ (مسکرا کے) درست

داروغہ صاحب۔ میر صاحب کے لطیفے بھی قیامت کے ہوتے ہیں یہ مسیحا کے واسطے

زندہ باش کیا خوب !!

فرمایئے یہ آپ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں یا واقعۃً اپنے کو جناب حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھا ہوا پا رہے ہیں؟۔ ہر تصویر بولتی ہوئی، ہر پیکر بے جان میں جان پڑی ہوئی!

یہ حکیم صاحب بھی ایک ہی جالینوس تھے۔ ذہانت اور حیلہ بازی کے معجون مرکب۔ عیاروں کے عیار اور حیلیوں کے استاد۔ شہر کے ایک نامی رئیس کا انتقال ہوا۔ اور آپ نے ان کی ادھیڑ سن بیوہ سے عقد کی ٹھانی بیگم صاحبہ پر نہیں ان کی جائداد پر لٹو ہو کر نفس ناطقہ میاں نبی بخش اس خدمت پر مامور ہوئے کہ ڈیوڑھی پر جا کر پہلے بی اماں مہری کو گانٹھیں اور ان کے ذریعہ سے نامہ و پیام شروع ہو۔ اور صاحب جائداد بیگم پر ڈورے ڈالے جائیں۔ میاں نبی بخش تقریر کرنے میں بقراط تھے لیکن جوڑ توڑ سوجھ بوجھ میں اماں کے پاسنگ کے برابر بھی نہ تھے۔ مہری حکمت اور رنظرت کی پڑیا تھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے خادم اور آقا کو خوب سبز باغ دکھائے۔ حکیم صاحب قبلہ مگن رہنے کہ بنیگ بیگم صاحب سے بڑھ رہے ہیں اور معاشقہ کا لٹو ڈوران کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور نکاح ۲۵ ہزار کے مہر پر بالآخر ہو اکس کے ساتھ۔ بیگم کی ایک نیش خدمت حبشی نویس کے ساتھ! آخر راز کھلتا ہے اور حکیم صاحب کی حکمت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ناول میں دوسرا قصہ بیگم صاحب کے صاحبزادے چھوٹے نواب اور ان کی عشق بازیوں کا چلتا ہے۔ چھوٹے نواب صاحب ہر طرف سے حیلیوں سے گھرے ہوئے ہیں اور شاہ جن کی صاحبزادی سبز قبا پر عاشق ہوئے ہیں۔ لاکھوں کی جائداد دیکھتے دیکھتے تباہ ہو کر رہ جاتی ہے ـــــ "صاحب"

کے دیس میں یعنی یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر خدا جانے کتنے واقعات اس طرح کے صبح و شام پیش آتے رہتے ہیں۔ وہاں کے افسانوں کو نہیں روزانہ اخبارات کی رپورٹوں کو اٹھا کر دیکھیے تو جعلسازی اور حرفت کی داستانیں اس سے کہیں بڑھی چڑھی ہوئی نظر آئیں گی۔ لیکن مشرق اور لکھنؤ کے معیار سے یہی بہت تھا مرزا صاحب نے قصہ کا نام ذات شریف رکھا ہے۔ اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ جہاں تک لکھنؤ کی ذہانت اور زیرکی کے تاریک رخ کا تعلق ہے انھوں نے مصوری کا حق ادا کر دیا ہے اور جعلیوں کے پورے پورے اعمالنامے مرتب کر دیئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اہل فرنگ کے ہتھکنڈوں پر نظر ہو تو یہاں کے بڑے سے بڑے "ذات شریف" بھی "شریف زادے" ہی نظر آئیں!

لیکن لکھنؤ کی مصوری، مرزا صاحب کے قلم سے بالکل ہی ناقص و ناتمام رہے گی اگر افشائے راز کے پردے اٹھ کر نہ رہتا۔ یہ ناول مرزا صاحب کی ناول نویسی کے ابتدائی دور کا ہے یعنی سنہ ۱۸۹۰ء کا لیکن افسانہ نگار کے کمالات مصوری کا اصلی مرقع، اسے آپ بیتی کہنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے پردے میں مصنف اپنا ہی پورا افسانۂ زندگی سنا دینا چاہتے تھے۔ مگر چند ہی باب لکھنے پائے تھے کہ کسی مصلحت یا مجبوری سے قلم رک گیا اور پھر مرزا صاحب اور اور کاموں میں پھنس گئے اس طرح جو راز افشا ہونے تھے وہ قیامت تک کے لیے سربستہ رہ گئے مرزا صاحب نے اپنا نام سید محمد زکی فرض کیا ہے اور صورت قصہ یہ رکھی ہے کہ سید صاحب موصوف کہیں غائب ہو گئے ہیں لیکن اپنی مفقود الخبری سے قبل اپنے ایک دوست مرزا رسوا صاحب سے فرمائش کر گئے ہیں۔ کہ وہ ان کی سوانح عمری مرتب کر دیں۔ اور اسلوب بیان وغیرہ کے باب میں کچھ ہدایتیں بھی زیب قلم فرما گئے ہیں،

لکھنؤ کی معاشرت کی اصلی جھلک اس کتاب کے اوراق میں نظر آتی ہے جہاں جو تصویر کھینچی۔ ہے بس وہ عین مین صورت ہما ہے۔ سنتے ہیں کہ نقل کا کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو لیکن اس استاد کے کمال مصوری کو دیکھ کر جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ وہ اصل ہی کیا جو اس نقل کے مطابق نہ ہوا۔ آپ کو دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہو رہا ہے اچھا تو آیئے مرزا صاحب کی رہنمائی میں نواب سلطان مرزا صاحب کے دولت خانہ کی سیر کر لیجئے۔ سیر ذرا طویل ہوگی لیکن امید ہے کہ منظر کی دلکشی طبیعت کو ملول نہ ہونے دے گی۔

نواب۔ حسین علی

حسین علی۔ حضور

نواب۔ بھئی آج پالی ہے؟

حسین علی۔ جی ہاں

نواب۔ بھئی ہمارے کپڑے منگاؤ

حسین علی۔ ڈیوڑھی پہ جاکے (زور سے چلا کے) حسینی نواب صاحب کی پوشاک دے جاؤ۔ "پوشاک"

سرخ پوشاک کا وہ گلہ بہت ہی پرانا جس کی بوٹیوں سے سنہرے تار بالکل جھڑ گئے تھے صرف ریشمی کام باقی تھا وہ بھی گلا ہوا سبز گرنٹ کی گوٹ کی لہریا اڑی ہوئیں۔ گلبدن کا پاجامہ سرخ شالباف کا نیفہ، کارچوبی مندیل، مگر دادا جان کے وقت کی ٹاٹبافی جوتہ، مقیشی پھندنے، کوئی سال بھر کا پہنا ہوا۔

نواب۔ (مندیل کو دیکھ کے) بھئی یہ درباری ٹوپی کیوں منگوائی دو پلڑی منگوالو۔

حسین علی۔ دیکھئے یہیں ہوگی تکیے کے نیچے۔

نواب۔ ارے بھائی دیکھتے ہو میرے ہاتھ میں بٹیر ہے تمہیں نکال دو۔

حسین علی۔ (پلنگ کے سرہانے جاکے) امراؤ جان، لے اٹھئے نواب صاحب کی ٹوپی ڈھونڈھنے دیجئے۔
امراؤ جان۔ (انگڑائی لے کے اُٹھیں مگر نہایت ہی برہم اور اٹھنے کے ساتھ ہی ایک گھونسا حسین علی کے رسید کیا) نگوڑ مارا سونے نہیں دیتا۔ بھاڑ میں جائے ٹوپی میں کیا جانوں ٹوپی کہاں ہے۔
حسین علی۔ اے لو! ناحق بن ناحق کو مارتی ہیں میں نے جانا آپ کے پاس ہوگی۔
امراؤ جان۔ مردے کی شامتیں آئی ہیں میں ٹوپی کو لے کے سوئی تھی میں کیا جانوں کہاں ہے؟ (یہ کہہ کے پھر لیٹ گئیں) لے ذرا لحاف اڑھا دے۔
ٹوپی واقعی تکیہ کے نیچے نہ تھی پلنگ کی پٹی کے پاس گنوں کے چھلکوں پر پڑی ہوئی تھی۔
یہ اس کمرے کا ذکر ہے جہاں نواب صاحب بنفس نفیس مع امراؤ جان صاحبہ کے آرام کرتے تھے۔
نواب۔ حسین علی
حسین علی۔ حاضر
نواب۔ دیکھو تو کھانا تیار ہے۔
حسین علی۔ (ڈیوڑھی پہ جاکے پھر زور سے پکار کے) حسینی نواب صاحب پوچھتے ہیں خاصہ تیار ہے۔
حسینی۔ خاصہ تو ابھی نہیں تیار ہے۔ نواب صاحب کو اندر بھیج دو۔
حسین علی۔ (نواب صاحب کے پاس جاکے) حضور محل میں تشریف لے جایئے
نواب۔ کیوں کیا کوئی بلاتا ہے۔
حسین علی۔ جی ہاں بلایا ہے۔

نواب۔ پوچھو تو کون بلاتا ہے۔ کیوں بلایا ہے۔ ڈھیلا سا کھینچ مار اگھر میں جائیے۔
حسین علی۔ (ڈیوڑھی پر پھر جاکے) نواب صاحب پوچھتے ہیں کس نے بلایا ہے۔
حسینی۔ کہہ دو بیگم صاحب نے بلایا ہے۔
حسین علی۔ حضور بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔
نواب۔ یاد کیا ہے۔ میاں تم کو بھی بات کرنے کی تمیز آج تک نہ آئی۔ بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔ بیگم صاحب میری اماں جان ہیں۔ کہ انھوں نے یاد کیا ہے؟ ارے بھئی جو کوئی بڑا بلاتا ہے تو اُسے کہتے ہیں یاد کیا ہے اور جو برابر والا یا چھوٹا بلاتا ہے تو اُسے کہتے ہیں بلایا ہے۔
حسین علی۔ درست! اب حضور کی صحبت میں رہوں تو سب سیکھ جاؤں گا۔
اتنے میں نواب صاحب کے ایک رفیق قدیم حسن خاں صاحب تشریف لائے۔
نواب۔ خاں صاحب ذرا میاں حسین علی کی تمیز داری دیکھئے گا فرماتے ہیں بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔
خاں صاحب! (حسین علی کی طرف نگاہ غیظ سے دیکھ کے) کیوں بھئی!
حسین علی۔ خاں صاحب مجھے کیا معلوم۔ وہ حسینی نے تو یہی کہا تھا کہ بلایا ہے میں نے بے وقوفی میں نے کہہ دیا کہ یاد کیا ہے۔
نواب۔ یاد کیا ہے! یاد کیا ہے! اماں جان نے یاد کیا ہے (یہ جملہ دوبارہ اس لیے ارشاد ہوا کہ فقرہ چست تھا مگر اس کی داد ابھی تک نہیں ملی تھی) حسین علی بدتمیز اس کی نزاکت کو کیا سمجھتا مسکرا کے چپ ہو رہا تھا اور خان صاحب پرانے بھنڈیت یا بقول امراؤ جان پرانے گھوسٹ تھے۔
خاں صاحب۔ (ایک قہقہہ لگا کے) واللہ نواب خوب کہی (اور پھر ایک قہقہہ)۔
نواب صاحب۔ بھئی خان صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تمیز داری دنیا سے اٹھ گئی وہ

آپ کو یاد ہے ہمارے باوا جان کے وقت کا خدمت گار ۔ اجی وہی بھلا سا نام تھا۔
خان صاحب ۔ کریم بخش کہئے ۔

نواب ۔ نہیں نہیں ! کریم بخش نہیں وہ تو اب نوکر ہوا تھا جی وہ بڈھا سا آدمی تھا باہر کا رہنے والا ۔ (اس وقت حسین علی اس کمرے میں تھا جہاں امراؤ جان آرام کرتی تھیں کیونکہ اب وہ بیدار ہو چکی تھیں اور حسین علی نے حقہ جا کے لگایا تھا۔

امراؤ ۔ نواب اس وقت ہیں کہاں ؟

حسین علی ۔ وہ کیا دالان میں ہیں جہاں مرغوں کے ٹاپے بٹیروں کی کابکیں ہیں ۔

امراؤ ۔ جبھی اور یہ موا کھوسٹ بھی پہونچ گیا ۔ ہاں آج بالی کا دن ہے نہ ؟

نواب ۔ اجی وہی کرم علی بیگ آپ کو یاد ہے نہ ؟

خان ۔ یہ خوب کہی ۔ آپ کو اچھی طرح یاد ہے آپ کا سن ہی کیا تھا اس زمانے میں،

نواب ۔ اور آپ کا سن کیا تھا ؟

خان ۔ میں جوان تھا ۔ داڑھی مونچھیں نکل چکی تھیں ۔

نواب ۔ تو یہ کہئے آپ مجھ سے بڑے ہیں ۔

خان ۔ اس میں کیا شک ہے ۔ ایسا ہوں کہ آپ کے باوا جان کے پاس نوکر تھا ۔

نواب ۔ اور نوکر آپ کا ہے میں تھے مشعلچیوں میں ؟ نان بزوں میں ؟

خان ۔ آپ کو یاد نہیں رکاب داروں میں ۔ آخر آپ کا عہدہ کیا تھا ؟

نواب ۔ (ہنس کے) ابے تو بتا تا کیوں نہیں کاہے میں نوکر تھا ۔

خان ۔ سبحان اللہ ! یہ ابھی خدمت گار کو ادب قاعدہ سکھایا جاتا تھا اور خود نواب صاحب کی زبان کیا آراستہ ہے یہ ابے تبے کیسی ؟ مردآدمیوں سے یوں نہیں گفتگو کرتے ہیں ۔

نواب ۔ تو آپ میرے مصاحب نہیں اتالیق ہیں ۔

خان ۔ اتالیق نہ سہی مرد آدمی تو ہیں ۔ مرد آدمیوں سے یونہیں گفتگو کرتے ہیں ۔

نواب ۔ آپ مرد آدمی ہیں، یہ آج ہی معلوم ہوا ۔ ابے تو پرانا چڑیمار ہے ہم سے باتیں بنانے چلا ہے تجھے مرد آدمی کون سمجھتا ہے ۔ ؟

بات یہ تھی کہ خان صاحب کے والد مرغبازوں میں ملازم تھے اور خود ان کا اسم ۔ بٹیر بازوں میں تھا ۔

خان ۔ تسلیم کرکے ۔ یہ آپ کی قدردانی ہے ۔

امراؤ ۔ (ذرا چلا کے جس میں نواب صاحب سن سکیں) واللہ خوب کہی !

حسین علی ۔ چڑیمار تو نہیں چمرگد کی اچھی ہوتی ہے (یہ چپکے سے کہا تھا)

امراؤ ۔ (خان صاحب سے چڑا کے) یہ موا چمر بگلا آگیا ۔

خان ۔ اور یہ بی چمر بگلی کہاں سے بولیں ۔

نواب ۔ رات کو تو پرانا کھوسٹ تھا اور اب الو کی دم فاختہ ہوگیا ۔

خان ۔ رات کو تو پرانا کھوسٹ تھا اور اب الو کی دم فاختہ ہوگیا

نواب ۔ لیجیے اب آپ بڑھنے لگے اور جو میں اس کا جواب دوں

امراؤ جان ۔ خدا کے لیے نواب جواب نہ دینا نہیں تو روٹیوں کو محتاج ہو جائے گا ۔

خان ۔ روٹیوں کو کیوں محتاج ہو جاؤں گی کٹنا پا کرنا ۔

امراؤ ۔ جی ہاں نواز گنج میں کٹنا پا کروں گی ۔

خان صاحب کچھ نواب والے فقرہ سے جھینپے ہوئے تھے اور کچھ امراؤ جان کے آخری جملہ سے اور بھی تپا آگیا تھا اب جو نواب نے اک ذرا شہ دی تو بالکل ہی ہتے سے اکھڑ گئے ۔ اب امراؤ جان سے اور ان سے خوب دو دو چونچیں ہوئیں نواب چپکے بیٹھے سیر دیکھا کئے ۔

حسن خاں۔ واللہ اب کبھی تو ان سے بولوں گا نہیں ان کی حقیقت ہی کیا ہے،
ہتی ہی کیا ہے ابھی تین برس کا ذکر ہے میرے بھانجے کی شادی میں
مجرے کو گئی تھیں اب نواب کے پاس رہ کے دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے۔
امراؤ۔ ابے جا۔ میں ایسے گھگھوؤں سے بات کب کرتی ہوں"
اتنی دیر کے لطف صحبت کے بعد کہیں یہ نہ کہہ اٹھئے گا کہ یہ ساری سحر آفرینی
بول چال کی صناعی اور ساری طلسم بندی روزمرہ کی شستگی کی ہے۔ مرزا صاحب
کے روزمرہ کا کیا کہنا لیکن اتنی صحیح اور سچی، اصلی اور گہری نقاشی کہیں محض
زبان دانی کے بل بوتے پر اور خالی خولی لطف زبان کے سہارے ممکن ہے؟
جذبات نگاری نرے ایک ادیب کے بس کی بات ہے جب تک وہ ادیب ساتھ
ہی حکیم بھی نہ ہو؟
ذکی۔ چودہ سال کی عمر کا ایک بڑا نیک چلن لڑکا ہے اور یہ تو یاد ہی ہوگا بیسویں
صدی کے وسط کا نہیں، اس سے بہت قبل کا ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شائق کیا بلکہ عشق
رشتہ کی ایک خالہ ہیں اور ان کی گیارہ بارہ سال کی لڑکی ہے بگن۔ قبول صورت
نک سک سے درست۔ ذکی کی والدہ کے پاس کل یہ خالہ آنے والی ہیں۔
شام کو ذکی کی بوا نیک قدم نے کہیں ذکی سے کہہ دیا کہ کل تمھاری خالہ اماں
آنے والی ہیں ذکی نے کہا کون خالہ اماں؟
نیک قدم۔ ایسے ننھے جیسے یہ جانتے نہیں تمھاری خالہ اماں اور کون جعفری بیگم
صاحبہ بگن صاحبہ کی اماں جان تمھاری ساس!
ذکی نے ہمت کر کے اتنا اور پوچھ لیا بوا کیا بگن بھی آئیں گی؟
"پوچھنے کو تو پوچھ لیا مگر ذکی ایسے شرما گئے تھے کہ اب اُن سے باورچی خانہ
میں نہ ٹھہرا گیا انھوں نے پہلے دالان کی طرف کا رُخ کیا دیکھا کہ اماں جان اور

باز اجان میں کچھ مصلحت سی ہو رہی ہے ۔ سمجھے کہ یہی باتیں ہوں گی ۔ جی تو چاہتا تھا کرسنیں، مگر مارے حجاب کے نہ جا سکے پہلے نیم کے نیچے بڑی دیر تک ٹہلا کئے پھر گیندوں کے پاس جا کھڑے ہوئے ایک ایک گیندے کو غور سے دیکھا کئے پھر تھوڑی دیر کنوئیں کی جگت پر بیٹھے رہے ۔"

دوسرے دن جمعہ ہے اور وہی دن ذکی کے لیے نگن کے آنے کا ہے اب میاں ذکی کے دل و دماغ کی سرگذشت مرزا صاحب کی زبان سے سنئے :۔

"ابھی ایسے لوگ بہت موجود ہیں جنھوں نے مکتبوں میں تعلیم پائی ہے ان سے پوچھو کہ جمعہ کی رات کیا چیز ہے نہ آج رات کو سبق یاد کرنا ہے نہ کل صبح کو سویرے اُٹھ کر مکتب میں جانا ۔ نہ مولوی صاحب کی متبرک صورت دیکھنا نہ پڑھنا نہ لکھنا نہ گھڑکیاں نہ قمچیاں ۔ کل ہم ہیں اور کنکوا، کل ہم ہیں اور چھلی چھلیا' محمد ذکی اُن لڑکوں میں نہ تھا جن کو چھٹی کی زیادہ خوشی ہوتی ہے اس لیے کہ اس کو پڑھنے کا شوق خداداد تھا ۔ مگر پھر بچہ تھا اس کو جمعہ کی خوشی کیوں نہ ہوتی تعطیل کی خوشی کس کو نہیں ہوتی اور یہاں ذکی کی جو حالت تھی وہ تو ناظرین قیاس کر سکتے ہیں ۔ صبح سے راستہ دیکھا گیا یہاں شام ہی سے انتظار ہے، اب رات کے نو بجے ہیں میاں ذکی اپنی پلنگڑی پر رضائی سے منہ لپیٹے پڑے ہیں سوتا کون ہے ؟ گو کہ سن ابھی چودہ برس سے کچھ ہی زائد ہے مگر حسن و عشق کے اکثر افسانے دیکھے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ خیالات کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی صاف ہو گئے ہوں گے، نگن کو دیکھ ہی چکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ دل میں کبھی خیال نہ آیا تھا کہ نگن کے ساتھ شادی ہو جائے بلکہ شادی کا شوق بھی آج ہی دل میں پیدا ہوا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ کیسی شادی ؟ نیک قدم نے یوں ہی کہہ دیا ہو گا نگن نگن کیسی نگن ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کسی کی یاد ایسی ہے ہی نہیں جسے کوئی قصداً دل سے بھلا دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نیک قدم نے یونہی کہہ دیا ہوگا، غلط! بھلا ایسی بات کہہ سکتی ہیں۔ پرائی بیٹی پرگانی ٹھہرانا کیا آسان بات ہے اور جو اماں جان سن لیتیں۔ نہیں اس بات کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے لو کچھ بج رہا ہے ایک، دو، تین، دس دس بج گئے یہاں نیند ہی نہیں آتی۔ ابا جان نے آرام کیا، اماں ابھی تک جاگ رہی ہیں پاجامہ کیوں چھپ چھپ سی رہی ہیں، کل خالہ ضرور آئیں گی دیکھئے بگن کو ساتھ لاتی ہیں یا نہیں خالہ تو کل آئیں گی ممکن ہے بگن بھی ساتھ آئے مجھے ابھی سے نیند کیوں نہیں آتی۔ دیکھئے بگن آتی ہے یا نہیں امید و یاس دونوں کے پلّے برابر ہیں ...... آخر تو نیند نہیں آتی ... . اے لو میں آنکھیں بند کرتا ہوں اب تو نیند آئے گی۔ یا اللہ نیند آجائے۔ ۔ ۔ ۔ خدا جانے ذکی کو رات بھر نیند آئی بھی یا اسی الجھن میں صبح، ہم تو جانتے ہیں نیند نہیں آئی اس لیے کہ جب میر صاحب نماز کے لیے اٹھے تو یہ بھی کھڑک سے اُٹھ بیٹھے۔"

آخر عمر میں یاروں نے خدا جانے کیا کچھ خرچ کرا کر، مرزا صاحب کو امریکہ کی کسی خانہ ساز یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری دلا دی تھی اور اس کی بنیاد پر مرزا صاحب کی فلسفیت کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیا تھا، حالانکہ مرزا صاحب کا حکیمانہ مرتبہ اس سے کہیں بالاتر تھا، ان کی فلسفیت کی بہترین اور معتبر ترین شاہد خود ان کی تصانیف ہیں۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تجزیہ جس جس عنوان سے اپنے افسانوں میں انھوں نے کی ہے وہ ایک حکیم اور فلسفی ہی کا قلم کر سکتا ہے خالی خوبی اہل زبان اور اہل انشا نہیں۔

بچپن کے عشق کی مصوری کوئی آسان کام نہیں اچھے اچھے جید اور کامیاب ناول نگار بچوں کی نقالی کرنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ بوڑھا آدمی آخر بچہ کہاں

سے بن جائے۔ اُردو کے بعض بڑے نامور افسانہ نویسوں پر ایک نظر کر جائیے لغزشیں نہیں اگر ہوئی ہوں گی تو جوش کے جذبات اور پھر جذبہ بھی کون سا عشق و محبت کا اور پھر محبت بھی بازاری قسم کی نہیں ایک بالکل کم سن شریف لڑکے کی جائز محبت اپنی منگیتر ایک شریف لڑکی کے ساتھ، اس کی ترجمانی کوئی مُنھ کا نوالہ نہیں۔ مگر دیکھئے مرزا صاحب اس نازکی کو بھی اس خوبصورتی سے طے کر جاتے ہیں کہ گویا یہ سارے راستے ان کے خوب دیکھے بھالے بڑے ہیں۔ بگّن جمعہ کو تو نہیں البتہ اتوار کو اپنی والدہ ماجدہ کی معیت میں ذکی کے گھر آتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں آپس میں مل بیٹھ باتیں کرتی ہوتی ہیں اور ادھر انگنائی میں گیندے کا کھیل شروع ہو جاتا ہے ایک طرف چودہ برس کا لڑکا دوسری طرف بارہ برس کی لڑکی اس کھیل میں دستور یہ ہے کہ جب گیندا کسی سے روکا نہیں جاتا اور زمین پر گر پڑتا ہے تو آنکھ سے اٹھانا پڑتا ہے، ایک دفعہ گیندا بگّن کی طرف سے زمین پر گر پڑا۔

ذکی۔ اچھا تو پھر آنکھ سے اٹھائیے

بگّن۔ ہم تو نہیں اٹھائیں گے۔ واہ کپڑے مٹی میں بھر جائیں گے بڑے آنکھ سے اٹھوانے والے۔

ذکی۔ تم کھیل میں دھاندلی کرتی ہو۔ ہم نے ابھی نہیں اٹھایا تھا؟

بگّن۔ تم اٹھاؤ ہم نہیں اٹھاتے ہم تو یوں ہی کھیلیں گے تمھارا جی چاہے کھیلو جی چاہے نہ کھیلو۔ لے لو میں جاتی ہوں۔

ذکی:۔ اچھا یوں ہی کھیلو۔ پھر ہم بھی اب نہ اٹھائیں گے۔

میاں ذکی کو دستور کی پابندی پر اصرار کرنا مناسب نہ معلوم ہوا پھر کھیل شروع ہو گیا۔ ذکی کے مزاج میں شرارت نہ تھی مگر اتفاق سے بگّن کے گال پر یا کہیں

اور پھول جا پڑتا اُس وقت عجیب لطف ہوتا تھا وہ بگن کا جھکنا وہ جھپ کراُڑھنی سنبھالنا۔ پھر جھنجھلا کے ذکی کو پھول مار بیٹھنا ذکی کا نشانہ بچا کے ہنسنا بگن کا کھسیانی ہو کے روٹھ جانا۔

بگن ۔ بھئی (سی کو بڑھا کے) جاؤ ہم نہیں کھیلتے ۔

ذکی کا منانا اچھا خیر جانے دو کوئی ہم نے جان کے پھول مارا؟ پڑ گیا اچھا بُرا ہوا پھر کھیلو، اب ایسا نہ ہوگا۔

بگن ۔ واہ! کس زور سے میرے گال پر پھپتل پڑا، میں نہیں کھیلتی۔

اور اصل بات یہ تھی کہ بگن تھک بھی گئی تھی ۔

ذکی ۔ کھیلو بھی تم ذرا سی بات میں بگڑ جاتی ہو۔

بگن ۔ ایسی ذرا سی بات، اور جو میری آنکھ میں لگ جاتا دیدہ پھوٹ جاتا تو؟

ذکی ۔ خدا نہ کرے کہیں گیندا کھیلنے میں آنکھ پھوٹ جایا کرتی ہے ۔

بگن ۔ اچھا بھلا ہم تو تمہاری آنکھ میں ایک لگائیں۔

ذکی ۔ لگاؤ۔

بگن ۔ اچھا تو ہم نہیں کھیلتے۔

ذکی ۔ کھیلو بھی (سماجت کے لہجہ میں)

بگن ۔ نہیں کھیلتے ۔ نہیں کھیلتے

ذکی ۔ (اور ایک بڑا گیندا توڑ کے) آؤ تم بھی کیا آدمی ہو اس سے کھیلیں دیکھو کیا بڑا گیندا ہے ۔

بگن ۔ دیکھیں (گیندا ذکی کے ہاتھ سے لے کے نوچ کھسوٹ جوتی کے نیچے مل ڈالا گیندا کیا مل ڈالا گویا میاں ذکی کا دل تلووں کے نیچے مل ڈالا۔

ذکی ۔ (آزردہ ہو کے) تمھارے مزاج میں بھی کس قدر ضد ہے ۔

بگن ۔ گردن کو ذرا کج دے کے اور بھووں کو اوپر چڑھا کے) ہمارے مزاج میں ضد ہے؟ پھر تمھاری بلا سے تمھیں کیا؟ (یہ کہہ کے پھر دل ہی دل میں کچھ سوچ کے) اچھا تو ضد ہی سہی اب تم ہم سے نہ بولنا۔

یہ کہہ کے یہ جادو جادو کے میاں کے پہلو میں جا بیٹھی۔ چلو سارا کھیل ہی بگڑ گیا اب میاں ذکی کا وہ حال ہے جیسے کوئی لڑکا بڑی مشکل سے ایک چڑیا پکڑے اور وہ دفعتہً ہاتھ سے چھوٹ کر فراٹا مار کے ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھے۔"

یہی نازک مقامات مرزا صاحب کے دعوئے عظمت و امتیاز کے روشن دلائل ہیں۔ ان کی نزاکتوں کا سنبھالنا نرے کھرے فلسفی کے بس کی چیز ہے نہ محض ادیب و انشا پرداز کے۔

انشائے راز افسوس ہے کہ بالکل ناتمام رہی اور راز کا افشار بالکل کیا معنی تقریباً ابھی نہ ہو پایا اس پر بھی مرزا صاحب کی بہترین تصانیف میں ہے، اور جس نے اس کو اور امراؤ جان اور اختری بیگم کو نہیں پڑھا اس نے مرزا صاحب کو جانا ہی نہیں۔ خیر افسانہ تو جیسا ہے ہی ہے افسانہ سے کہیں کچھ بڑھ کر دلکش اور بیش بہا تمہید افسانہ ہے یہاں مرزا صاحب نے فرضی افسانہ نگار یعنی مرزا رسوا کو کچھ ہدایتیں نثر کی زبان اور طرز بیان سے متعلق کی ہیں۔ یہ ہدایات کیا ہیں، ہر اردو نویس کے لئے ایک بہترین پندنامہ! آج ۱۹۳۲ء میں حیرت ہوتی ہے کہ آج سے ایک قرن قبل ۱۸۹۶ء میں مرزا صاحب کی نظر ان نکتوں تک کیونکر پہونچ گئی تھی۔ نقد و تنقید کے یہ گر ہاتھ آجانے کے بعد اگر آج کل کے بہت سے "رئیس التحریر" بڑے بڑے قلم باز آپ کی نظر سے گزر رہیں، تو اس کی ذمہ داری اس مقالہ نویس پر نہیں۔ بہر حال اب وہ ہدائتیں خود مرزا صاحب کی زبان مبارک سے سن چلئے

فرماتے ہیں :-

" لکھئے تو اس طرح لکھئے کہ جس طرح ہم آپ باتیں کرتے ہیں، نہ کہ اس عبارت میں جو کسی انگریزی کتاب کا لفظی ترجمہ معلوم ہو اور وہ بھی ایسا کہ مطلب نہ دل میں اور لفظیں کتاب میں .... میں انگریزی لفظوں سے چڑھتا نہیں ہوں، شوق سے استعمال کیجئے مگر یہ لفظیں جو اُردو زبان میں ایسی کھپ گئی ہیں کہ اب ان کو سب سمجھنے لگے ہیں۔ خیر، ناول بھی چنداں ثقیل نہیں ہے .... قیامت خیز تو یہ لفظیں ہیں ڈیڈیم کیتی، انٹروڈکشن، ایسوسی ایشن، سوسائٹی سوشل ریفارم، پولٹیکل پارٹی، اسٹڈی، ڈیوٹی، بیوٹی .... یہ لفظیں ابھی اور لوگوں کو بولنے دیجئے اور آپ اتنے عرصے تک توقف کیجئے کہ مثل بوتل کاگ، بوتام، گلاس، لمپ، پادری، گرجا، اسٹیشن، ریل وغیرہ کے عام فہم ہو جائیں۔

اور یہ ترکیبیں جو آج کل کے انشا پردازوں نے ایجاد کی ہیں ایک قلم نظری کر دیجئے مثلاً

ایک غمگین کرسی، ایک ہمدرد میز، ایک سکین چھری، ایک شرمناک تو ایا ایک دلسوز کانٹا، نہ ماہر چمچے، تین بے وفا پلیٹیں۔ ایک موقر قلم، ایک سنجیدہ دوات، ایک متبسم چاقو، ایک متحرک انگارہ۔ ایک نمکین چلم، ایک فاصل حقہ ایک غریب قطرہ۔ ایک غضبناک دریا۔ ایک طرحدار مرغی۔ ایک شیریں ادا بطخ۔ ایک پری تمثال فاختہ۔ ایک مہذب آلو۔ ایک آزاد مینڈک، ایک روشن ضمیر چوہا، ایک متین گدھا۔ ایک حلیم بھیڑ۔ ایک سریلا گیدڑ۔ ایک دلستان کتا، ایک دلربا بلی۔ ایک خوش لہجہ جھینگر ایک دوراندیش مکھی۔ ایک دغا رگدھا، ایک بیتاب مٹر، ایک خوش آہنگ مگر ستم شعار مچھر۔ ایک تکلیف دہ مگر خوشنما سے رینگنے

والا کھٹل ۔ ایک نحیف الجثہ مگر جگر خراش پسو ۔ ایک انوکھا مگر حیرت بخش پھرتی کے ساتھ کود جانے والا بندر۔"

یہ نمونے مرزا صاحب نے اپنی نوجوانی میں دیکھے تھے غریب کو کیا خبر تھی کہ ان کی زندگی ہی میں اور اُن کے بعد تو اور بھی ذیل کی ترکیبیں بڑے بڑے اونچے دعوے والوں کے لیے مایۂ نازش و افتخار ہوں گی:۔

"ایک مہک شام ، ایک مؤدب فاصلہ ، ایک روشن تھرتھری ، ایک مترنم نشیب ، ایک زہرہ گداز تبسم ، ایک تیکھی غرّاہٹ ، ایک دخار خاموشی ، ایک متلاطم سکون ، ایک رقیق خرام ، ایک ملائم قہقہہ ، موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے بھیڑ ، ایک نور پاش خراماں پیکر آتش ، ایک گلابی رنگ میں ڈوبی ہوئی برق متحرک ، مجھ میں اپنے اشارہ مبہم سے ایک انجذاب مضطر پیدا کر رہی ہے" اور میں اس قوت مجہول کی طرف کھنچا جا رہا ہوں ، یہ نزہت بار ہستی ، گھنگھروؤں کی جھنکار اک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں نغموں کی طرح پھڑپھڑانے لگی : ہال کے اندر قہقہے دھڑک رہے تھے ، ملی جلی باتوں کی تیز تیز چیخیں تھیں اور یہ تمام شور مجموعی طور پر ایک بیتاب کراہ کی طرح لرز رہا تھا ، ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ جو دھری کی ہستی پر بیٹھا یہ مضطر ترکیب عناصر میرے وجود کو میری روح لرزاں کو مسحور کر رہا ہے اپنی آنکھوں کے خندۂ سیال سے اپنے بالوں کی بوئے رنگینی سے ، اپنے خرام رفتار سے" "وہ آئینہ سیما لڑکی اپنی عفت و شرم میں محافظ رکھتی تھی ، تھوڑا سا توقف یقیناً عقل و فراست کا ایک جزو ہے جو ایک ستارہ سے دوسرے ستارہ تک اپنا کام کر رہا ہے" "اے اوپر والے آسمان ، اے روشنی کے عمیق غار تجھے دیکھ کر میں آلہانہ جذبات سے کانپنے لگتا ہوں ، تیری بلندی کی طرف میرا اپنے تئیں اچھال دینا یہ ہے میرا عشق تیرے ہی آلہانہ امکانات کے لیے میرا صحن رقص ہے اور

تیری فضا آلہانہ قمار بازی کی کھلی ہوئی بساط؛

لفظوں اور ترکیبوں کے کشتِ زعفران کی سیر ہو چکی اب ذرا عبارتوں کا لہلہاتا ہوا تختۂ چمن ملاحظہ ہو، عبارتیں پڑھتے جایئے اور جن جن سروں پر یہ ٹوپی ٹھیک آرہی ہو دل ہی دل میں یاد کرکے انھیں خدا کے حوالے کرتے جایئے پہلا نمونہ :-

" وہ انوکھی کانی بھینس جس کا ٹوٹا ہوا سینگ اگلی بے رحمانہ حکومت کے تاریخی حالات کا ایک بے نظیر فوٹو ہے جس کی ہیئت کذائی ہندوستان کے قدیم تاریک جاہلانہ اور حد سے زیادہ بدکاواک مگر نیچرل اور منفعت سے بھرے ہوئے سامان تعیش کا ایک سچا چربا ہے ...... مگر جو افسوس کہ اس آزاد سوبلائزڈ و منصف گورنمنٹ کے عہد حکومت میں بھی کیچڑوں میں پھنس کر بلا مدد اس لاٹھی کے جو کبھی کبھی اس کے پٹھے پر پڑ کر اسے تڑپا دینے والی ہے ہرگز نہیں نکل سکتی۔

دوسرا نمونہ :-

" وہ سفید بگلا جس کے لیے باریک نوکدار جو صامند مگر بے رحم چونچ ایک شور انگیز بھنبھنانے والے شکار کی بدقسمتی سے ایک نیچرل مگر مضحک انداز کے ساتھ ایک سکنڈ کے لیے کھل کر پھر بند ہو جانے کے قابل ہو جاتی ہے ......

اور جس کی طویل ٹانگیں کسی اعلیٰ درجے کے نیچرل پوئیٹ یا ناولسٹ کے جادو نگار قلم سے نکلنے والے طولانی مگر معنی خیز جملوں یا مصرعوں کی طرح بہت ہی دلچسپ اور موزوں ہیں مگر یہ انٹرسٹنگ اڑنے والا جانور ایک کثیف الیشائی مکان کے صحن میں کس بے دردی کے ساتھ مکھی کی ٹوہ میں دن بھر پھرا کرتا اور کبھی نہیں تھکتا ہے۔

تیسرا نمونہ :-

" وہ اولڈ فیشنڈ انڈسٹینڈ چوہا جو اپنے سنٹر میں بود و باش کے لیے کمپلیکیٹڈ پیچ بنا تا ہے "

"ادب لطیف" اور پھر اس کے بعد "ترقی پسند ادب" کے دُہرے دُہرے عذاب اس زمانہ تک اُردو پر کہاں مسلط ہونے پائے تھے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس قسم کے نمونے مرزا صاحب کی نظر سے چھوٹنے پاتے :-

"جب تکوینِ عالم کی بالکل ابتدا تھی مذاقِ آفرینش امواجِ آب سے لاعب نظر آتا تھا، شبستانِ ناز کے پُرلطف قہقہائے برق کسی کی آرمیدہ مژگان کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں" ایک پُراسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے، چاندنی ایک موسیقی ہے سہانی، نرم، اور معطر" زور زور سے چنگھاڑیں مار کر روؤں "

"سید محمد ذکی انشائے راز کے رستم داستان، اسی لکھنؤ کے رہنے والے تھے ... گفتگو میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع نہ تھا نہ یس نہ نو، نہ اومائی گاڈ، نہ ہاؤڈو یوڈو، نہ گڈ مارننگ، نہ ول ڈن، نہ ول کم، نہ تھینکس، بس یہی ہاں نہ، درست، بجا، قبلہ، حضرت، آیئے، تشریف لایئے۔ آداب، تسلیمات، مزاج شریف، دعا عرض کرتا ہوں، یہی ان کا روزمرہ تھا"

ان کی اُردو وہی اُردو تھی جو لکھنؤ کے شرفا کی زبان ہے خیر وہ اُردو تو ان کی ہو ہی نہیں سکتی تھی جس پر انگریزی کا دھوکہ ہو لیکن ساتھ ہی انھیں اس اردو کے لکھنے کا بھی عارضہ نہ تھا جس کے سمجھنے کے لیے انسان کو صراح و قاموس کے ازبر کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ مثلاً اس قسم کی اردو ان کی ہرگز نہ تھی :-

"ان کی شان ارفع تھی اس سے ارتکاب صرف تبرّف اپنے ملابس اور مآکل بلکہ سائر تناولات میں جائز رکھتے"

"یکہ فی الجملہ تشبت و تنسف و تلہف و تشطارت و بطارت، و تجشم، و تجاسر، و تمازح غرضکہ تنافر سے ان کو کلیۃً نفرت تھی بلکہ کسی قسم کا استغراب و استطاف

"استعظام، واستنکاف، واستخفاف ان کی غیت وجبلت و قریحت، وعزیزت، میں نہ تھا۔"

شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے "مگر ایسے اشعار، جیسے ایک مولوی صاحب مرحوم اکثر نظم فرمایا کرتے تھے :-

اڑنے میں طائران ہوا باز کرکے پر — کرتے ہیں بند اپنے زمیں پر اُتر کے پر

یا ایسے اشعار جو لکھنؤ میں بعض صاحبوں کے مذاق کے موافق ہیں۔

حاسدِ میرے ذرۂ تا زیب تک گئے — رستہ میں بال تقش اور اک تھک گئے

یا اساتذۂ حال میں سے بعض کے اشعار

سالک مسلک ایجاد ہوں، مکڑی کی طرح — راہیں سو دل سے نکالوں جو ذرا دل ٹھہرے

یا ایک اور بزرگ فرماتے ہیں۔

سوزاں ترا جو دفن نہ ہو دشت گرم میں — تکمید بوم ستم غزالانِ چین نہ ہو

یا پھر دورِ ترقی پسندی کے یادگار اِس قسم کے مصرعہ :-

(۱) تند ہوائیں بال بکھیرے چیخ رہی ہیں

(۲) کھُردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں۔

(۳) رات کے بوجھ سے وہ ہانپتی سی خاموشی

سنتے ہیں کسی زمانے میں وصایائے افلاطون کا مطالعہ فلسفہ کے ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا، بس چلتا تو آج ان وصایائے مرزا اور ان کے جدید ایڈیشن کو ادب کے ہر طالب علم کے درس لازم میں رکھ دیا جاتا کہ اردو غریب کو نئے نئے مجتہدین زبان کی مشقِ ستم سے کچھ تو نجات ملتی

مرزا کی شاعری کے کچھ نمونے اوپر گزر چکے ہیں کچھ اب ملاحظہ ہوں لیکن

اس کے قبل کچھ دھندلا سا نقشہ ذہن کے سامنے اس کا بھی لے آیئے کہ جس وقت مرزا صاحب نے غزل گوئی شروع کی ہے اس وقت لکھنؤ کی شاعری اور غزل گوئی کا رنگ کیا تھا جس ماحول میں مرزا صاحب نے آنکھیں کھولیں وہاں دھوم تو کچھ اس طرز سخن کی تھی۔

چھینٹے کل آپ جو غیروں سے لڑے پانی کے　　پڑ گئے سینکڑوں بس ہم پہ گھڑے پانی کے

میری تربت پر لگایا نیم کا اس نے درخت　　بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

اس بت رشک سلیماں کی کمر　　سایۂ مژگان چشم مور ہے

کمر تیری ہو وہ جس نے کہ توڑا ہو جتیوں کی　　تری آنکھوں کے آگے لے پری آہو چکارا ہے

رونے کی مجھے لہر جو اے چشم ترا آئی　　کو سوں نظر آئے گا نہ ٹاپو نہ ترائی

نام کس کس کے گنے جائیں اچھے اچھے استادان با کمال، اور بڑے بڑے شعرائے نامدار اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، مشاعروں میں داد اسی کلام کی ملتی اور محفلوں میں واہ واہ کے نعرے اسی سخنوری پر بلند ہوتے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ وقت کے ادبیات کا رخ پھیر دینا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ مرزا ہی کا دل و جگر تھا کہ اس فضا میں رہ کر اور اس ماحول میں پل کر شعر کہے تو اس آن بان کے ؎

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے　　دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

نالہ رکتا ہے تو سر گرم جفا ہوتا ہے　　درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام　　جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا　　دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے

غالبؔ گور پہونچ جاتے ہیں مرنے والے　　وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں　　ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں — دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوق اظہار اگر ہے تو میرے دل کو نہ توڑ — اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

چھوٹی بحروں میں اور بھی قیامت کرتے ہیں ؎

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی — یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی — کیوں تری زلف رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے — موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذت معصیت عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

ایسی زمینوں میں خوب خوب گل بوٹے کھلائے ہیں ؎

روش وحش و طیر یاد آئی — دشت وحشت کی سیر یاد آئی
کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ — پھر وہی راہ دیر یاد آئی
زاہد و آج ہم کو پھر وہ شے — جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی
دیکھ کر شہد ان ان کو — لالہ و گل کی سیر یاد آئی

غالبؔ کی مشہور زمین "بادہ و ساغر کہے بغیر" "دشنہ و خنجر کہے بغیر" میں قافیہ بدل کر کیا کیا گلکاریاں کی ہیں ؎

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ — چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کئے بغیر
وعدہ ہو یا کہ قول وفا لیتے ہیں نا زاہد — مانتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کئے بغیر
زاہد سے گفتگو ہو کہ واعظ سے بحث ہو — بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کئے بغیر
ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں — باز آئیں گے نہ ہم مراجعا کئے بغیر
رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم — چھوڑیں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کئے بغیر

اب ایک غیر مطبوعہ غزل کے تین شعر اور سُن کے اس ورق کو الٹ دیجئے ؎

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم ۔۔۔ ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مرجانے سے

دوسرا شعر اس سے بڑھ کر ہے۔

دیکھ اس طرح بھی مل لیتے ہیں ملنے والے ۔۔۔ شمع کا بس نہ چلا بزم میں پروانے سے

اور تیسرا ان دونوں سے بھی بڑھا ہوا ہے ؎

جیتے جی اس کے نہ کہنے مگر اب کہتے ہیں ۔۔۔ لذت غم نہ رہی غیر کے مرجانے سے

یہ کلام جو ابھی تک ملاحظہ میں آیا اس کا بیشتر حصہ امراؤ جان سے منقول ہو لیکن آخر کے یہ دو شعر کہیں چھپے ہوئے نظر سے نہیں گزرے اور راقم تصانیف مقالہ نویس کے فخر کے لیے یہ کافی ہے کہ یہ دونوں شعر مرزا صاحب نے اسے لکھنؤ میں اس کے غریب خانہ پر ۱۹۱۹ء میں خود اپنی زبان سے سنائے تھے اور جن تیوروں کے ساتھ دیکھ اس طرح بھی مل لیتے ہیں الخ والا شعر پڑھا تھا وہ آج تک یاد ہیں۔ شعر پڑھتے وقت بوڑھے سے جوان ہو گئے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس کو شعر میں مخاطب کیا ہے وہ سامنے سر محفل موجود ہے۔

مرزا صاحب کے افسانوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول امراؤ جان ادا ہے، یہ بیسویں صدی کی بالکل ابتداء کی تصنیف ہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل یعنی واجد علی شاہی دور کی ایک شستہ، نستعلیق، باتمیز، خوش گو، خوش فہم شریف طوائف کی آپ بیتی ہے۔ شریف کے لفظ پر چونک نہ پڑیئے اللہ کی ہر مخلوق کی طرح بازاری کسبنیں بھی کسی درجہ میں شرافت کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں۔ مرزا صاحب کی فرمائش بلکہ اصرار پر یہ بی صاحبہ اپنی آپ بیتی جا بجا سے سُناتی ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے جاتے ہیں اور کہیں کہیں حاشیہ بھی چڑھاتے

جاتے ہیں، بچپن سے نوجوانی، نوجوانی سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا ہر دو تفصیل کے ساتھ آئینہ ہو جاتا ہے اور لطف زبان کے ساتھ، تجربہ، عبرت و بصیرت کے سامان بھی ہوتے جاتے ہیں۔ طوائف کے نام سے نفرت حقارت ہی کے جذبات نہ پیدا ہوں، اور یہ خیال نہ گزرے، کہ جو بھی اس پیشہ میں ہے وہ بہر حال و بہر صورت ذلیل و ملعون ہی ہے۔ خدا جانے کتنی شریف زادیاں، اشراف گھرانوں کی بہو بیٹیاں آفت کی ماریاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں زمانہ کی گردش کسی نہ کسی بہانہ سے اس پیشہ میں لا پھنساتی ہے اور وہ بیچاریاں حالات کے منجدھار میں بہتی ہوئی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی اس ناپاک اور گندی زندگی میں جا پڑتی ہیں، جسم شیطان سے بے عزتی کے سبق لیتا رہتا ہے لیکن ضمیر کی سلامت کی آواز بھی اندر اندر جاری رہتی ہے۔

امراؤ جان کی قسمت میں ناموری، بدنامی کے راستہ سے لکھی ہوئی تھی، پوری ہو کر رہی۔ مگر وہ کوئی سات پشتوں کی بیسوا نہ تھی فیض آباد میں ایک گھر گرہست خاندان میں پیدا ہوئی نام نہ امراؤ تھا نہ امراؤ جان، ماں باپ نے امیرن کہہ کر پکارا تھا بچپن کی قلمی تصویر ملاحظہ ہو۔ آنکھیں اگر نم نہ ہوئیں جب بھی دل میں گداز تو پیدا ہو ہی جائے گا۔

"شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں، رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے، کچھ بہشتی، کچھ نائی، دھوبی، کہار، میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے معلوم نہیں کا ہے میں آسم تھا، کیا تنخواہ تھی اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔ ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت

کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھئے، میں کمر سے لپٹ گئی، ابا ابا کر کے دوڑا دامن میں چمٹ گیا، ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھالیا پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر آتے تھے کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں، کبھی پتاسوں یا تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے اب اس کے حصّے لگائے جا رہے ہیں اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں وہ کتارا چھینے لیے جاتا ہے میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکار رہی ہیں۔ ابا ادھر کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے ابا اللہ گڑیا نہیں لائے دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کے نہیں آیا چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی، چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی، ہاں میں تو نیا پہنوں گی، جب اماں کھانا پکا چکیں مجھے آواز دی، میں گئی۔ روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی دسترخوان بچھا اماں نے کھانا نکالا سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا، خدا کا شکر کیا۔ ابا نے عشا کی نماز پڑھی سو رہے صبح کو تڑکے ابا اٹھے نماز پڑھی اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔ میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور دیتے آنا۔ ابا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔

بچپن کا بھی کیا معصومیت کا زمانہ ہوتا ہے! لڑکی غریب گھرانے کی تھی مگر اپنے حال میں مست اور مگن، باپ کی آنکھ کا تارا ماں کے کلیجہ کی ٹھنڈک گناہ کی راہوں سے ناواقف اور بدی کی چالوں سے بے خبر اس غریبی پر سیکڑوں لاکھ ارتیں قربان جھونپڑے کو محل سمجھنے والی، اور محل کیا معنی معصوم کے حق میں تو یہی

چھوٹا سا گھر نمونۂ جنت تھا۔

ہائے کیا دن تھے، کسی بات کی فکر ہی نہ تھی، اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیونکہ ہجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا، نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں جہاں میں رہتی تھی، وہاں کوئی مکان میرے مکان سے زیادہ اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کوٹھریا کھپریل میں رہتے تھے میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے، صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی تھی اِدھر اُدھر دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا، دوسری طرف کوٹھے کا زینہ کوٹھے پر ایک کھپریل، دو کوٹھریاں، کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے، ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا۔ محلّہ کی عورتیں خود ہی کوئیں سے پانی بھرلاتی تھیں۔ ہمارے ابّا جب گھر سے وردی پہن کے نکلتے تھے لوگ انھیں جھک جھک کے سلام کرتے تھے میری امّاں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

بات سگے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ بچپن ہی میں ٹھہر چکی تھی۔ اور اسی سن میں منگنی ہو جانا اس وقت کے رواج میں داخل تھا۔ میں نے اپنے دولھا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو کبھی دیکھا تھا بلکہ ساتھ کھیلی تھی ابّا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے کچھ روپے کی اور فکر تھی، رجب کے مہینہ میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دولھا کی صورت کریمن (ایک دھنئے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے سن تھی) کے دولھا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے۔ میرا دولھا گورا گورا ہے کریمن کے دولھا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے

میرے دولھا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں ۔ کریمن کا دولھا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے، میرا دولھا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا سبز سبز چھینٹ کا دگلہ گلبدن کا پاجامہ مشالہ کی ٹوپی، مخملی جوتہ۔ کریمن کا دولھا سر میں ایک پھینٹا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے؛

محلہ کا ایک گنڈا جان اور آبرو دونوں کا خواہاں ہوگیا۔ ایک روز شام دھوکے سے اپنے گھر بلا مُنہ میں کپڑا ٹھونس، بیل گاڑی پر ڈال، رات کی اندھیری میں روانہ ہوگیا قسمت نے لکھنؤ پہنچایا اور چوک کی ایک مشہور ڈیرہ دار کے ہاں جواب سن اتر نے پر نائکہ بن چکی تھی بکوایا۔ اب امیرن قبل اس کے سن تمیز آئے، او اپنے نیک و بد کی عقل پیدا ہو، امراؤ جان تھیں اور جس چراغ کو کسی اندھیرے گھر کا اجالا ہونا تھا اس کے نصیب میں شمع کی طرح گردش محفل آئی۔ وکان امر اللہ مفعولا ، رنگ نکھرا۔ دوکان چلی۔ جنس عصمت بکی نہیں لٹی۔ فتنہ رفتہ رفتہ قیامت بنا۔ نواب زادوں، امیرزادوں، کے شہر میں قدر دانی کی کیا کمی، سرکاروں، دربادوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پر دل کا کانٹا آخر دم تک نہ نکلا، طبلہ کی تھاپ روح کے زخم کا مرہم نہ بن سکی۔ پازیب کی جھنکار اور موتیوں کے ہار، لٹی ہوئی عزت کے آنسو نہ پونچھ سکے۔ اور میلی اُڑھنی میں مگن رہنے والی لڑکی دل کا چین بھاری بھاری پیشوازیں پہن کر نہ خرید سکی۔ ماں باپ غریب تھے پر عزت دار تھے۔ اشرفیوں کے توڑے ان کے ہاں بیشک نہ تھے پر غیرت کے خزانہ کے مالک تھے۔ نوٹوں کی گڈیاں ان آنکھوں نے کبھی کیوں دیکھی ہوں گی لیکن یہ آنکھیں وہ تھیں جو شریفوں کے کسی مجمع میں نیچی نہیں ہونے پائی تھیں۔

یہ غریب امیرن امراؤ جان ادا بن کر بے شمار دولت کما کر اور اسی قدر لٹا کر عین اپنے شباب شہرت میں اپنے وطن فیض آباد پہونچی ہیں۔ یوروپ ہوتا تو خاک وطن

خود ایسی قابل فخر ایکٹرس ایسی مشہور زمانہ "آرٹسٹ" کی بلائیں لینے دوڑتی، پریس کے نمائندے "انٹرویو" کے لیے جھپٹتے، خوش آمدید کے تاروں کا انبار لگ جاتا۔ کس دھوم دھام سے استقبال ہوتا۔ کیسی کیسی تصویریں چھپتیں۔ یہاں جو کچھ گزری اسے خود امراؤ جان ہی کی زبان سے سنئے، اور اگر پہلو میں دل ہے تو پہلے دل کو ہاتھوں سے سنبھال لیجئے:-

"ایک دن کمرے پر بیٹھی ہوئی ہوں، ایک صاحب شریفانہ صورت ادھر سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کے دیا حقہ بھر دیا حالات دریافت کرنے سے معلوم ہوا بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں وثیقہ پاتے ہیں میں نے باتوں باتوں مقبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے۔

نواب صاحب۔ اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں اب وہ کارخانہ ہی نہ رہا بالکل نیا انتظام ہے۔

میں۔ اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب۔ ہاں تھے، تم انھیں کیا جانو۔

میں۔ غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرہ پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب۔ وہی جمعدار نا جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں۔ مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے یہ افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب۔ یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں۔ ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب۔ تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا۔

ہیں۔ اُس دن ان کے ساتھ تھا۔ ایسی شکلیں ملتے کم دیکھی ہیں بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب ۔ جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لیے میں نے ادر کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی میں نے دو سوز سنائے بہت محظوظ ہوئے رات کچھ زیادہ آگئی تھی۔ گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سُن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رو یا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا اس کی تیاری کرنے لگی جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی محلے کا نام یاد نہیں مکان کے پاس بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا، اسی کے نیچے شگیرہ تانا گیا تھا گرد قناتیں تھیں بہت بڑا مجمع تھا مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل امڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے میں نے ان کو کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لیے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو، ایک مکان کے دروازہ کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے، جی چاہتا تھا کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگالیں گی مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں

کو معلوم ہے پھر جی کہتا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ اک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں کیا مجبوری ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا۔ تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو۔

مَیں۔ ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)

عورت۔ اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمھیں کوئی بلاتا ہے۔

مَیں۔ اچھا کہہ کے اس کے ساتھ چلی، ایک ایک پاؤں سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا وہ عورت اُس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چار پائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے میں ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکے کھڑی ہوئیں۔

ایک۔ لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو۔

مَیں۔ جی ہاں۔

دوسری۔ تمھارا نام کیا ہے۔

مَیں۔ (جی میں آیا کہہ دوں امیرن مگر پھر دل تھام کے) امراؤ جان

پہلی۔ تمھارا وطن خاص لکھنؤ ہے

مَیں۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی۔ تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو۔

مَیں۔ (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے بمشکل جواب دیا) جی ہاں

دوسری۔ کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

مَیں۔ ذات کی پتریا نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں۔

پہلی۔ (خود رونے کے) اچھا تو روتی کیوں ہو آخر کہو تو تم کون ہو؟
میں۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں۔ کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔
اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں اب بالکل تاب ضبط نہ تھی سینے میں دم رکنے لگا تھا۔
اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کے کان کے لو کے پاس غور سے دیکھا اور کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے۔
دوسری: "ہائے میری امیرن" کہہ کے لپٹ گئی دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں۔ ہچکیاں بندھ گئیں آخر دو عورتوں نے آکے چھڑایا۔ اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری ماں بیٹھی سناکی اور روتا کی باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے، صبح ہوتے ہی رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی، مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی۔
دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آکے کل روپیہ مجرے کا واپس دے دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے کمرے کے دروازے بند کر دن بھر پڑی رویا کی۔
اللہ اللہ یہ مشرق کی بیسوا ہے کوٹھوں پر بیٹھنے والی عصمت فروش، یہ غیرت اس کی ہے جس نے ایک عمر بے غیرتی کی روٹی کھائی۔ رو یاں رو یاں گناہ کی تہ کاریوں سے خاک سیاہ۔ لیکن دل کی گہرائی میں خشیت الٰہی اب بھی زندہ و بیدار غفلت ہے۔ یہ بغاوت نہیں، لغزش ہے، سرکشی نہیں۔ ماں بیٹی کی ملاقات کا پُر درد منظر آپ

دیکھ چکے، اب بھائی بہن کی یکجائی بھی، اسی طرح کلیجہ تھامے ہوئے ملاحظہ ہو۔

"دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر آیا، میں نے حقہ بھروا دیا۔ پاندان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں، میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان۔ کل تمھیں مجرے کو گئی تھیں، یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔

میں: "ہاں" اتنا کہہ کے اس کے چہرہ کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان۔ (سر نیچا کرکے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

میں۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان۔ ہم تو سمجھے تھے تم مر گئیں، مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں۔ بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کرے میں جلد موت دے۔

جوان۔ بیشک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔ کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

میں۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی۔ نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔ اب سہی۔

جوان۔ اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں۔ اور آئی بھی تھیں تو تمھیں اس محلہ میں مجرے کو آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں؟

میں۔ ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان۔ اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں۔ اب کیا ہوتا ہے۔

جوان۔ (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے، اب (چھری کمرے سے نکال کے مجھ پر جھپٹا دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔

اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے

" ارے دوڑو بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔

جوان۔ (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی۔ . . . . . .

اتنا کہہ کے داڑھیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی سے رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہونچا تھا اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا، میں بھی رونے لگی، ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارہ سے منع کیا ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں خوب رو چکے۔

جوان۔ (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں۔ کل چلی جاؤں گی۔ مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان۔ بس اب دل سے دور رکھو۔ معاف کرو۔ کل اماں نے تمھیں گھر پر بلا لیا۔

میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں۔ تم نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہاں تمھاری جان کا خیال ہے تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سُن ہی لیا کریں گے۔

جوان۔ برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا:

یہ زندہ احساسِ غیرت و شرافت بگڑے ہوئے لکھنؤ اور فیض آباد کا ہے اُجڑے ہوئے اسلامی ہند کا ہے، اس خزاں سے بہار کا اندازہ کرنا کیا کسی کے لیے کچھ بھی مشکل ہے۔؟

بیشہ ور طوائف کی آپ بیتی ختم ہو چکی، اور کتابِ حیات ختم ہونے پر ہے، اس وقت اس کے منہ سے جو بول نکلے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ ہم سنیں، آپ سنیں خاک کے پتلے سنیں، نور کے بنے ہوئے فرشتے سنیں، جنھوں نے کچھ نہیں سنا ہو وہ سنیں جو بہت کچھ سن چکے ہیں وہ بھی سنیں:۔

"کفایت شعاری کی وجہ سے اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کرے جاؤں گی، وہاں کا مالک اللہ ہے، میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں اور حتی الوسع روزہ نماز کی بھی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں مگر پردہ والیوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں، خدا ان کا راج سہاگ قائم رکھے اور رہتی دنیا تک ان کا یہ وہ رہے اس موقعہ پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہوکے ایک نصیحت کرتی ہوں چاہئیے کہ وہ اپنے دل پر نقش کرلیں۔

اے بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کرسکتا اور نہ تو اس لائق ہے سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منھ دیکھ کے دوسرے کا منھ کبھی نہیں دیکھتی تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا، خیر میری تو جیسی گزرنا تھی گزر گئی، اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں، جے دن دنیا کی ہوا کھانا ہو کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی اگرچہ یہ آرزو کم بخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک

دل سے نہیں نکلتی۔ مجھے اُمید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا
اب میں اپنی تقریر اس شعر پر ختم کرتی ہوں اور سب سے اُمیدوار دعا ہوں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی،،

آغاز جیسا کچھ بھی ہوا ہو۔ انجام توبہ، انابت، خشیت، رجوع الی اللہ پر
ہو رہا ہے اس انجام پر ہم کو، آپ کو کس کو رشک نہ آئے گا؟

---

(۲)

اُردو کا واعظ شاعر[1]

آج سے کوئی ۲۵ سال اُدھر کی بات ہے الہلال افق کلکتہ سے نیا نیا طلوع ہوا تھا اور ملک کی ساری فضا ابوالکلامی ادب و انشاء کے غلغلہ سے گونج رہی تھی، کہ ایک روز اس کے کسی مقالہ کے ذیل میں یہ شعر نظر سے گزرا ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہو گئی، لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا اور ج صرف شعر تھا شاعر کا نام نہ تھا دل نے کہا اور اس کہنے میں تامل و تذبذب کی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ شعر غالب کا ہے، دیوان غالب میں پڑھنا یاد اگر نہیں پڑتا، نہ سہی۔ دیوان مطبوعہ میں اگر موجود نہیں نہ ہو، رہ گیا ہوگا۔ لیکن ہے یقیناً غالب کا اس مسلّم اُستاد کے سوا اور کون ایسا کہہ سکتا ہے؟ غالب کا اتنا پختہ رنگ، بجز خود غالب کے اور کہیں مل ہی کہاں سکتا ہے؟ ـــــ

---

[1] تحریر جنوری ۱۹۳۶ء ۔ نظر ثانی ۱۹۵۲ء

حاضری اسی درمیان میں ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی (اکثر ہوتی ہی رہتی تھی) ذکر اس شعر کا آیا، ارشاد ہوا کہ غالب کا نہیں حالی کا ہے ۔
ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر؟ بے چارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی، روکھے پھیکے۔ اشعار کے ناظم، انھیں غزل سے غزل کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور استاد غالب کے تخیل وہی، بندش وہی، زبان وہی، حالی کے کلام میں یہ حسن بیان نہ لطف زبان، نہ یہ رُوح، نہ یہ جان،! نہ تخیل میں رعنائی، نہ طرز ادا میں زیبائی! غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور کچھ خفیف ہوکر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہتی ہے، دیوان حالی اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود!
کون حالی؟ نہ ہی جن کے تغزل و تشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں، بس شروع سے یہ خیال جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں اور رنگین بیانیوں سے انھیں واسطہ کیا، ایک خشک نظم نویس، کلام میں عاشقانہ مضامین کا قحط۔ بندشیں سست۔ خدا غریق رحمت کرے دور اول کے اودھ پنچ[1] کو اور بھلا کرے اس کے نقادان فن اور شہسواران سخن کا۔ یہ اسی کا فیض تھا کہ ایک شامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں، پختہ کاروں، لائق فائق زبان دانوں کے دل میں بس یہی رچا ہوا تھا۔ ادھر حالی کا نام آیا ادھر کلام کی بے نمکی، بے اثری، اور روکھے پن کی تصویر آنکھو کے سامنے پھر گئی!

---

[1] انیسویں صدی عیسوی کے آخری حصول میں لکھنؤ کا بہت مشہور و ممتاز ادبی اور ظریفانہ ہفتہ وار۔ ظرافت اس دور میں شخصی تعریض و تمسخر اور کسی کو "بنانے" کے مرادف تھی۔

بات دل سے نکلتے ہی نکلتے نکلتی ہے، اس ایک شعر سے کیا ہوتا ہے شعر کیسا ہی بامزہ سہی، بہرحال ہے تو ایک ہی ــــ اور دو ایک بامزہ شعر کس کے ہاں نہیں ملتے؟ مشق کرتے کرتے معمولی شاعر بھی دو چار شعر تو اچھے سے اچھے نکال ہی لاتا ہے ــــ اچھا تو آج کی صحبت میں یہی نہ ہو، کہ ہم آپ مل کر دیوانِ حالی کے اوراق اُلٹ پلٹ، اِدھر اُدھر سے دیکھ ڈالیں، عجب نہیں کہ کچھ اور چیزیں بھی ہاتھ آجائیں۔ اور یہ گھنٹہ پون گھنٹہ کی محنت محض رائیگاں نہ جائے، دیوان کھولیے ردیف الف میں ایک مطلع یہ ملے گا ؎

فطرت میں تری صوفی، گر نورِ صفا ہوتا تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

اس غزل میں فرماتے ہیں ؎

ہم وقتِ وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت رونا تھا بہت ہمکو روتے بھی تو کیا ہوتا

وداع و رخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپ کی نظر سے گزر چکے ہونگے لیکن حسرت و یاس کی جو تصویر اس رونے میں نہیں ہنسی میں دکھا دی گئی ہے اس کا بھی کوئی جواب ہے؟

اور پھر فرماتے ہیں ؎

جو جان سے گزر لے، وہ چاہے سو گزر لے گر آج نہ تم آتے، کیا جانئے کیا ہوتا

عاشق کی جانبازی کے افسانے بھی سب دہراتے چلے آئے ہیں لیکن اس "کیا جانئے کیا ہوتا" کے کنایہ کے اندر جو بات ہے وہ کسی تصریح کے بعد بھی پیدا ہونی ممکن ہے؟

ناصح اور عاشق کی مڈبھیڑ دنیائے شاعری کی بڑی پرانی حکایت ہے حالی بھی ایک بار ملتے ہیں ؎

جو دل پہ گزرتی ہے، کیا تجھ کو خبر ناصح کچھ ہم سے سنا ہوتا، پھر تو نے کہا ہوتا

حالی نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے، ایک آہ سرد بھر کر صرف اتنا کہتے ہیں اور کہہ کر چپکے ہو جاتے ہیں کہ ؎

کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تو نے کہا ہوتا

ناصح کو بے درد، بے حس، سب نے مانا ہے یہاں عاشق کو اپنی داستان درد کی دردانگیزی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کے خیال میں وہ ناصح کے دل پر اثر کئے بغیر رہ نہیں سکتی، پتھر آخر کیسے موم ہو کر نہ رہے گا، کوئی فولاد اتنا گرم ہو کبھی تو۔

نشان نہ تھا، گمان نہ تھا، اس زمین میں خوب خوب گل بوٹے کھلائے ہیں ؎

آتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں — طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی — مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

کیئے خشک نظم نگاروں کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے؟ اور آگے چلئے ؎

بزم دشمن میں نہ جی سے اترا — پوچھنا کیا تری زیبائی کا

بدگمانی کے لیے غیر کا سایہ پڑ جانا بھی کافی ہوتا ہے یہاں عین بزم رقیب میں رونق محفل بنا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ کمال دلربائی ہے کہ جی پھر بھی نہ ہٹا۔ کمال اپنا نہیں، اپنے وفور عشق کا نہیں، تمام تر انھیں کا، انھیں کے حسن بے پایاں کا" پوچھنا کیا تیری زیبائی کا" گویا جمال بھی انھیں کا اور کمال بھی انھیں کا۔

غالب کا مشہور مطلع ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہی زمزمہ ذرا حالی کی زبان سے سنئے اور واہ واہ کرتے رہ جائیے ؎

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں — ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا

تجلیات حق کہاں نہیں؟ دکھائی نہ دیں تو قصور اپنی نظر کا ہوا یا حسن نامحدود کا! شعر یہ کہا ہے اور اپنی ساری متانت و ثقاہت کے باوجود، حضرت زاہد کے دامن پر چھینٹے ڈالتے چلے گئے ہیں ؎

جانی نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ   ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

زاہدوں کی قسمت میں تو مُزد ہی مُزد ہے۔ محض رحمت حق کا نزول ظاہر ہے کہ انھیں پر ہوگا جو اپنی سیہ کاریوں کے باعث حق دار، زاہد سے بھی اس رحمت کے نہ ہوں گے؟

شوخی اور طراری، دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ظرافت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں، کہ اس کے ڈانڈے عریانی و فحاشی سے مل مل جائیں۔ حالی شریف ہیں اور متین۔ اول میں بھی متین آخر میں بھی متین۔ ذہانت، شوخی، ظرافت، طنز، موجود ان کے ہاں سب کچھ لیکن متانت کی شان سب پر غالب گویا حضرت اکبر الٰہ آبادی کا پورا جواب۔ یہاں ہر منظر پر متانت کا پردہ پڑا ہوا وہاں ہر چہرہ پر ظرافت کا غازہ لگا ہوا۔ اُن کا یہ رنگ کہ روتے ہوئے کو بھی گدگداتے جائیں ان کا یہ ڈھنگ کہ ہنسی آئے بھی تو پہلے منہ پر رومال رکھا دیں۔ ایک کے ہاں تمام تر شوخی و رنگینی، دوسرے کے ہاں ایک ذرا اُداسی اور غمگینی! ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کا شور، دوسرے کے ہاں ادب لحاظ اور قاعدہ کا زور۔ ایک کی مجلس طرب افروز، دوسرے کی صحبت سبق آموز۔ ان کے میز پر شراب و کباب، ان کے دواخانہ میں بیدمشک اور عرق گلاب۔

باتیں سب عاشقوں والی کیے جاتے ہیں لیکن وہی
نالہ رکتا ہوا، تھمتی ہوئی فریاد رہے!

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے نیچی نظروں، شرمیلی نگاہوں کے ساتھ۔ لغزش متانہ کے بجائے، ہر قدم سلامت روی کی تصویر، لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جائیے اور دل ہی دل میں مزے لیتے جائیے ؎

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا　　سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

مطلع تو معمولی ہے لیکن آگے گلکاریاں ملاحظہ ہوں ؎

تم کہ ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط　　اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر　　دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچتے ہیں ؎

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے　　پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

ذرا ان بزرگ کی کم سخنی ملاحظہ ہو۔ کچھ نہ کہنے پر سب کہہ جاتے ہیں، رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے۔ وعدہ تھا کس سے اور پورا جا کر کہاں ہوا دبی کہانی نمایہ کجامی زندگی کی پرانی داستان، کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو کھل کھیلتا اور تسمالہ کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کر جاتا۔ ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی، کسی اشارہ کے بھی روادار نہیں، وہی نیچی نگاہیں اور زبان پر صرف اس قدر کہ ع

پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

پھر آگے کہتے ہیں ؎

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر　　کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائیگا

یہاں استاذ مومن کا بھی ایک مطلع یاد کر لیجئے ؎

کیوں کر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

خاکساری کے مضامین آپ نے بارہا سنے ہوں گے۔ کیسی کیسی نازک خیالیاں

امر ہیں صرف ہو چکی ہیں۔ اور تعلی تو ہمارے شاعر حضرات کی گویا جاگیر ہی ہے
اب ذرا دیکھئے کہ اردو کا واعظ شاعران دونوں اضداد کو کس بلاغت سے جمع
کرتا ہے۔ اور ایک مختصر سے شعر کے اندر کس نادر اور اچھوتے انداز سے تعلی سے
خاکساری پیدا کر رہا ہے اور خاکساری سے تعلی نکال رہا ہے۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا　　خاکساری اپنی کام آئی بہت!

بیت الغزل سن چکے تو اب مطلع اور ایک آدھ شعر اور بھی ملاحظہ میں آجائیں ؎

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت　　پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے　　مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا　　دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کہئے اب بھی حالیؔ دہلی نرے کھرے "واعظ" رہے؟ وہی خشک اور بے مزہ۔
پھیکی اور بے اثر نظم کہنے والے رہے؟

اور پھر اس غزل کے بعد یہ غزل ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت　　نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل　　کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے　　یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں　　دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

مقطع سے متعلق ایک لطیفہ، مولانا شبلی کی زبان سے سنا ہوا عرض کرنے کی اور
اجازت دیجئے۔ علی گڈھ کے طالب علموں کی شوخیاں سارے زمانہ میں مشہور ہیں
حالیؔ کی یہ غزل جب اول بار شائع ہوئی تو کالج کے ایک نوجوان، وائد داحمد امروہوی
مرحوم کو اس پر تضمین کی سوجھی۔ سننے کے قابل مقطع کا بند ہے ؎

چاہئے جبکہ ارادہ کرے کوئی انساں　　دیکھ لے خوب کہ ہے شوق وہاں کے شایاں

سُن کے لوگوں سے کہ آئے تھے وہ اُلفت کہاں ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر صورت

تعزیرِ جرمِ عشق والا شعر شروع مضمون میں عرض ہو چکا اب دو شعر اور اسی غزل کے پیش ہیں ؎

گزرو دل سے پانی بھی اے چارہ گر شفا آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد
مدت سے تھی دعا کہ ہوں بد نام شہر شہر بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

عاشقی میں بجز رسوائی اور بدنامی کے اور رکھا کیا ہے۔ عاشق کا کمال یہ ہے کہ اس زمانہ بھر کی رسوائی سے مغموم نہیں ہونا بچنا نہیں چاہتا، الٹا خوش ہوتا ہے اور اس کی طلب و تلاش میں نکلتا ہے!

معرفت کے رنگ میں یہ مطلع چھوڑتے نہیں بنتا ؎

ہے تکیہ تری عطاؤں پر وہی اصرار ہے خطاؤں پر

اکبر نے بھی ایک مصرعہ میں یہی مضمون ادا کیا ہے۔ ع

اسی کی عظمت سے کوئی خائف، اسی کی رحمت پہ کوئی غافل!

شاعر اردو کے تھے لیکن کہیں کہیں عربی مصرعہ اس بے تکلفی سلاست اور برجستگی کے ساتھ لگائے ہیں کہ جیسے شعر اپنی ہی زبان میں کہہ رہے ہیں

یاد میں تیری سب کو بھول گئے کھو دئے ایک کھنے سب امراض
دیکھئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

کہتے کہتے، کہتے ہیں ؎

لَا اُبَالِی بِاَنْ یُّھْمَا قِبْحِیْ کُلُّ نَاسٍ وَّ اَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ

یہ وہی مضمون ہے جسے محمد علی جوہر اپنے رنگ میں یوں باندھ گئے ہیں ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف   کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

ایک اور عربی مصرعہ اسی غزل میں ع

ہے فقیہوں ہیں اور ہم میں نزاع   هَلْ لَنَا فِی نِزَاعِنَا بِسَتَ قَاضِیْ

لیجئے، دیوان کی جلدی جلدی ورق گردانی کرتے کرتے ہم آپ، ردیف میم تک پہنچ گئے ایک غزل پر نظر جم کر رہ گئی۔ معاملہ بندی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ ساتھ، یہ متانت، یہ احتیاط، یہ ضبط، حالی ہی کا حصہ ہے ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم   سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم   کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغ عشق   بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو   کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

یہ اشعار اگر حالی کے دیوان سے نکال کر، مومن یا شیفتہ کے دیوان میں لگا دیے جائیں تو کسی کو کچھ پتہ بھی چلنے پائے گا؟ "گرانیاں ہیں" - "کہانیاں ہیں" والی غزل اس زمانہ کی ہے جب حالی شاعر۔ حالی واعظ کے قالب میں آچکے تھے، اس پر بھی ذیل کے دونوں شعر دیکھئے، شعر کی زمین ہے کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہے ؎

کہتے ہیں جس کو جنت وہ ایک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہونچی اب ناتوانیاں ہیں

غزلوں کے متفرق اشعار کثرت سے گزر چکے، اب ایک پوری غزل نمونہ

کے طور پر ملاحظہ میں آجائے کہ انتخابِ اشعار میں ردّ و رعایت کا شبہ نہ رہے، فرماتے ہیں اور ہر شعر پہ پڑھنے والے سے داد وصول کیے جاتے ہیں ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں!

ہیں دورِ جام اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں!

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیانِ کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

خالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

غزل نو شعر کی ہے، مراتب کا فرق یقیناً ان کے درمیان ہے لیکن فرمائیے اس میں پست و لغو شعر، نکال ڈالنے کے قابل کون سا ہے؟ کلام کی خشکی، اگر اسی کا نام ہے، تو آخر، تری، کے نمونے کہاں ملیں گے؟

ردیف 'رہے'، میں دو مختصر غزلیں، 'گماں رہے'، 'نشاں رہے'، کی زمین میں ہیں اس زمین کے دو ایک شعر ایسے صاف، سہل، اور گویا سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں کہ بے تکلف زبان پر چڑھ گئے ہیں،

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حسنِ قبول اگر ایسے کلام کو حاصل ہو جائے۔ تو اس پر حیرت ہی کیوں کی جائے۔

مغز معنی سے قطع نظر سلاست، شستگی، روانی، بے ساختگی کسی حیثیت سے بھی یہ کلام کسی بلند سے بلند نمونہ سے پست ہے ؟

کہنے والوں نے کہا ہے کہ حالی جب تک قدیم رنگ پر قائم رہے اچھی اچھی غزلیں کچھ نہ کچھ بہر حال نکالتے ہی رہے مگر جب سے جدید رنگ میں پڑے اپنی شاعری کو غارت کر کے رکھ دیا۔ یہ قول کسی حد تک تو شاید صحیح ہو لیکن تمامتر صحیح تو یقیناً نہیں ابھی ابھی جو نمونے کلام کے گزر چکے، ان میں بڑا شعر اگر دورِ قدیم کے تھے تو چار دورِ جدید کے بھی)۔ دونوں میں کوئی فرق د امتیاز محسوس ہوا؟ کلام جدید کے بہت سے نمونے اوپر گزر چکے، اب زرد چار شعر اسی دور کی ایک اور غزل کے ملاحظہ ہوں ؎

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو وہ صرف تمنا ہوا چاہتا ہے

ندرت قافیہ ملاحظہ ہو۔

دفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
غم اشک کو تیغ سمجھے تھے ہمدم سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ ان دنوں وحشت دل درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

خشکی اگر متانت بیان ہی کا دوسرا نام ہے تو یقیناً یہ اشعار بھی خشک ہیں لیکن اگر متانت بیان عیب نہیں ہنر ہے، تو خدارا کوئی بتائے کہ خشکی کا اطلاق ایسے کلام پر کس طرح کیا جائے ؟

غزلیات کا حصہ اب اچھا خاصا ہو چکا، عجب نہیں کہ اہلِ بزم، مقالہ نگار کی آشفتہ بیانی و ژولیدہ نگاری سے افسردہ و ملول ہو چلے ہوں۔ اس لیے اب صرف ایک غزل اور اسی دورِ جدید کی سن کر یہ ورق الٹ دیجیے ؎ -

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے | آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت | وہ امتحان برش و شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے | ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے سے تصور مژگاں میں چند روز | دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے
دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ | گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے
حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں | بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اور تو جو کچھ ہے، خیر نہی ہے، خود شوخی کے نمونوں سے یہ کلام کب خالی ہے؟ تیسرے شعر کے اندر لطیف شوخی کی جو کیفیت ہے، اسے لفظوں میں کوئی کیونکر بیان کر سکے؟ بس کیا ہے وہی کہ نرم مخملیں سا پنجہ، آہنی دستانہ کے اندر چھپا ہوا۔ شوخی حدود متانت سے قدم باہر نہیں نکال سکتی۔ اور اپنی لطیف ترین صورتوں ہی میں محدود رہ جاتی ہے۔

قلم کا مسافر، اب ذرا دم لے۔ شعراب ایک آدھ نہیں رہا۔ دس بیس بھی نہیں سوچا اس شعر ہو چکے کوئی تیر کوئی نشتر اب بھی اس کلام سے وہی بدگمانی چلی جائے گی کہ خشک اور نرا واعظانہ ہے؟ خیال اب بھی یہی قائم رہے گا کہ حالی غزل گوئی میں ہیٹے ہیں؟ غالب اور مومن اور شیفتہ آسمان شعر کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں۔ انھیں کے معیار پر کسئے، جانچ لیجئے پرکھ لیجئے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن اس پر بھی حالی کا اصلی میدان غزل کا میدان نہیں ان کی شاعری 'واہ' کی نہیں 'آہ' کی ہے، جوش و ولولہ کی نہیں، حزن و حسرت کی ہے۔ نوعمری میں جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو گل و بلبل کے افسانے چھوڑ، اور زلف و ابرو کے جنجال سے نکل، بس قوم کے ہو رہے تھے۔

اور اب وہ تھے اور قوم کے اقبال کا ماتم۔ ساز کوئی سا بھی ہوتا نغمہ یہی ایک نکلتا۔ کسی بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان، چہیتا بیٹا، آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو، اس وقت باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ منہ قہقہوں کے لیے کھلے گا یا آہ و بکا کے لیے؟ زبان پر حسرت و یاس کے کلمے ہوں گے یا کوئی نئی پھبتی سوجھے گی؟ — بس جو حال ہمارا آپ کا، ساری دنیا کا، بیٹوں کے لیے، بھائیوں کے لیے رہتا ہے حالیؔ کا وہی حال ساری امّت اسلامیہ کے، ساری ملت کے لیے۔ ساری قوم کے واسطے تھا۔ یہی حال ان آنکھوں نے بعد کو مشہور قومی لیڈر محمد علیؒ جوہر کا دیکھا، فرق یہ تھا کہ محمد علیؒ کے ہاں طبیعت میں غضب کی تیزی تھی۔ حالیؔ کے ہاں آہ سرد بھی آئین و ضابطہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ ایک کے ہاں تمام تر جوش اور شوریدگی، دوسرے کے ہاں منبط و تحمل سے ملی ہوئی سنجیدگی۔ محمد علیؒ جدھر سے گزرتے، ایک عالم تہ و بالا کر دیتے، حالیؔ دلوں میں اندر ہی اندر حزن و غم کی پھانس چھو کر رہتے۔ محمد علیؒ چیخیں مار مار کر خود روتے ہیں، اور دوسروں کو رُلا مارتے ہیں۔ حالیؔ سر جھکائے اُداس صورت بنائے۔ چپکے چپکے بیٹھے کلمہ شریف کا ورد کر رہے ہیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتے جاتے ہیں اور جب آنکھیں بے اختیار نم ہونے لگتی ہیں تو جھٹ رومال نکال آنسو پونچھ ڈالتے ہیں طبیعت پر حسرت اُداسی اور غم گینی مستقل طور پر غالب ہو گئی تھی۔ جو بات بھی منہ سے نکلتی درد کی کسک سے خالی نہ ہوتی دہلی کے طبیب اعظم، حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھنے بیٹھے تو لگے بجائے فرد کے قوم کا ماتم کرنے۔ غم نصیب سانحہ زدہ بوڑھیوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ دل پر جب تازہ داغ کھاتی ہیں۔ تو ساتھ ہی پچھلے داغ بھی تازہ ہو جاتے ہیں اور بَین اپنے آج ہی پر نہیں گزرے ہوئے کل، اور بھولے

بسرے ہوئے پرسوں پربھی کرنے لگتی ہیں۔ حالی کا سینہ بھی داغوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ محمود خاں کے مرثیہ کے آخری بند ملاحظہ ہوں۔ اپنے اصل مذاق طبیعت کی مصوری خود ہی کر دی ہے۔ پڑھتے جائیے، اور دل اگر درد مند ہے تو سرد آہیں بھرتے جائیے، ؎

شاید اب پہونچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اسکی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے مثال
ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہر ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گا ہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہہ قصیدہ پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالۂ دریا نہ کا لوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

"ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" اس ایک مصرعہ میں واعظ شاعر کی پوری آپ بیتی آگئی ـــــ

۔ تھا کہ ظرافت نہیں آتی تھی، طنز تو ایسا کر جاتے اور اس کثرت سے کر گئے ہیں کہ کوئی اگر طنزیات حالی کو یکجا کرنے پر آ جائے تو طنزیات مضحکات پر اچھا خاصہ مشتمل رسالہ تیار کرے جائے لیکن وہی متانت کا طبعی رنگ ظرافت پر بھی چھایا ہوا۔ کھلکھلا کر ہنسنا تو جانتے ہی نہیں۔ جب دوسروں کو ہنسانا چاہتے بھی ہیں تو خود بھی زیر لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں ـــ گورے اور کالے کی

قسمت کے فرق کا تماشا اپنے وطن کی سرزمین پر آپ بارہا دیکھ چکے ہوں گے، اب ذرا ایک یہ منظر مرقع حالی میں بھی دیکھتے چلئے ؎

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ بحث مشت
کوکھ میں کالے کی ایک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہونچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آگے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہونچے جا کے دونوں خیر سے
ضارب اپنے پانوں و مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگذشت
تہہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ کر جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پہ وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو نہایت جاندار
ایک کالا پٹ کے گورے سے جو فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اسکی بیماری کا کیونکر اعتبار

اب کون ایسا بے انصاف ہوگا۔ جو اس کے بعد بھی حالی کی خشک نگاری کا شکوہ سنج رہے چلا جائے گا؟

مشاعرے کی محفل گرم ہے۔ کاملین فن جمع ہیں۔ دہلی کے دور آخر کے اُستادوں کا مجمع ہے لوگ منتظر ہیں کہ غالب و شیفتہ کے شاگرد رشید کی زبان سے کوئی پھڑکتی ہوئی مزیدار سی عاشقانہ غزل سننے میں آئے گی۔ رندی و ہوسناکی کی روح تازہ ہو جائے گی۔ شاعر کا منہ کھلا، تو یک بیک یہ معلوم ہوا کہ مشاعرہ نہیں مجلس عزا ہے اور غزل نہیں نوحہ پڑھا جا رہا ہے۔ اگلے عزیز و رفیق سب ایک ایک کر کے

یاد آرہے ہیں اور نام لے لے کر دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے۔ نوحہ آج بھی اور کاغذ پر چھپا ہوا دل والوں کے لیے مؤثر ہے۔ ساٹھ سال پیشتر کیسا کچھ رقت انگیز رہا ہوگا! خصوصاً جس وقت قدر دانوں کے بھرے مجمع میں شاعر کی زبان سے ان کے پُراثر لہجہ کے ساتھ ادا ہوا ہوگا ؎

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ۔۔۔ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر، ہمیں یاد آئیں گی ۔۔۔ کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح ۔۔۔ دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک ۔۔۔ دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو ۔۔۔ اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ ۔۔۔ ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں ہنستا ہے ۔۔۔ ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں ۔۔۔ نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق ۔۔۔ اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد ۔۔۔ شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو ۔۔۔ ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ۔۔۔ نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر ۔۔۔ اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

آج اگر ہمارے آپ کے آنسو نہیں ٹپک پڑتے تو ہمیں "دہلی مرحوم" کے مرحوم ہونے کا احساس ہی کب ہے؟ آنکھوں میں تو اب "نئی دہلی" بسی ہوئی ہر

مشاہجہان آباد کو جانتا کون ہے؟ اسمبلی ہال کے سامنے۔ لال قلعہ کو جھانکنے بھی کون جاتا ہے؟ افسانۂ ماضی کو تو ہم ماضی کے حوالہ کر ہی چکے، اب رونا آئے بھی تو کس بات پر؟ بھائی اور بیٹے کی تازہ میت پر سب روتے ہیں، بھولے بھالے دادا پردادا کی موت کے ذکر پر آنسو نکلتے کس کے دیکھے ہیں؟

مسدس مدوجزر اسلام فرط شہرت سے محتاج نہ کسی تعریف کا نہ کسی تعارف کا نہ کسی نئی مدح و توصیف کا، نہ کسی جدید نقد و تبصرہ کا۔ ایک مسلسل داستان درد شروع سے آخر تک ہے، آخر میں بطور ضمیمہ ایک قصیدہ لگا ہوا ہے۔ شاعر مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے، اسلام اور مسلمانوں کا حال زار، دربار رسالت میں عرض کر رہا ہے، اس عرض و معروض میں اللہ اکبر کس قدر اخلاص ہے اور کسقدر نیاز، کس درجہ تعلق خاطر ہے اور اصلاح حال کے لیے کس درجہ بیقراری!

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے　　اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

۱۵، ۲۰ شعروں میں اپنے حال کا عبرت انگیز مقابلہ اپنے ماضی سے کرتے چلے گئے ہیں اس کے بعد کہتے ہیں ؎

گو قوم میں تیرے نہیں اب کوئی بڑائی　　پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر　　مدت سے اُسے دور زماں میٹ رہا ہے

آگے پھر وہی مدوجزر اقبال و زوال کی داستان سرائی ہے لیکن پھر سنبھلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں شکوہ کس کا اور شکایت کس کی؟

اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی　　دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا　　جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے

اس متن کی تھوڑی سی شرح کے بعد پھر متوجہ ہوتے ہیں ؎

برتاؤ ترے جبکہ یہ اعدا سے ہیں اپنے — اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہے
اُمت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن — دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

اُمت کا جو تعلق رسول ؐ کے ساتھ ہے، اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی تعلق کر سکتا ہے! ؎

جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اڑتی — وہ خاک ہمارے لیے دارو ہے شفا ہے
جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف — اب تک وہی قبلہ تری اُمت کا رہا ہے
جس شہر نے پائی تری ہجرت سے سعادت — کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

آخر میں گویا دل چیر کر سامنے رکھ دیتے ہیں ؎

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے — نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے
خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں — پر فکر ترے دین کی عزت کا سدا ہے
گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری — اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہے
عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں — اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

اس منزل پر پہنچ کر شاید یاد پڑ جاتا ہے کہ موقع نازِ یوسفی کا نہیں، نیازِ یعقوبی کا ہے۔

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے — باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گِلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب — یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ دل کی شاعری اُس کی تھی، جس کے محض ایک خشک واعظ گو ناظم ہونے کا ڈھنڈورا کس بیدردی اور ناانصافی کے ساتھ ایک عالم میں پٹ گیا تھا۔"

واعظ شاعر کی عام وعظ گوئی اور عام شاعری کے نمونے آپ نے دیکھ لیے۔ غزلیات کے حصہ کو چھوڑ کر باقی شاعری ایک مسلمان شاعر کے دل کی آواز تھی۔ ماتم تمام تر زوالِ امتِ اسلامیہ کا، مصوری تمام تر جذباتِ ملی کی۔ اب ختم صحبت پر ایک

اچھی سی نظر حالی کی آفاقی شاعری پر بھی ہو سکے تو بہتر ہے، آفاقی شاعری اسلامی شاعری سے الگ اور متغائر کوئی چیز نہیں، اس کے بلند ترین مقام کا نام ہے۔ بندہ اور پروردگار کے تعلق سے بڑھ کر وسیع دعالمگیر تعلق اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ شاعر نے جب براہ راست رب العالمین سے آہ وفریاد شروع کر دی، اور شاعری میں قیود و تعینات کی جگہ وحدت نے لے لی، بس وہیں سے آفاقی شاعری ہو گئی۔ اور یہیچ مدان تو یہ عرض کرے گا کہ حالی نے عمر بھر بجز ایک بیوہ کی مناجات کے اگر کچھ نہ کہا ہوتا، تو ان کے لیے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ دونوں میں بس تھی، باتیں اتنی سچی اور ایسی روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئیں کہ آسمان کے فرشتے بھی سن کر سر دھنیں۔ بول اتنے میٹھے کہ خود معصومیت بڑھ کر بلائیں لینے لگے۔ ذرا سنیئے اور دل تھام کر سنیئے،

اے سب سے اول اور آخر   جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے بالا ہر بالاتر سے   چاند سے سورج سے امبر سے
سب سے انوکھے سب سے نرالے   آنکھ سے اوجھل دل کے اوجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے   دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھ سا نہیں کوئی   تجھ سے سب ہیں تجھ سا نہیں کوئی
بید، نرا لے بیماروں کا   گاہک مندے بازاروں کا
سوچ میں دل بہلانے والا   بپتا میں یاد آنے والا

حمد باری صدہا بار آپ سن چکے ہوں گے۔ اتنی سادہ، اتنی معصومانہ، ساتھ ہی اتنی مؤثر حمد کا کوئی جواب اردو کے خزانے میں کہیں ہے؟

اے اٹکل اور دھیان سے باہر   جان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا   بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا

ایک کو تو نے شاد کیا ہے ۔۔۔ ایک کے دل کو داغ دیا ہے
کھیتی ایک کی ہے لہراتی ۔۔۔ ایک کا ہر دم خون سُکھاتی
حال غرض دنیا کا یہی ہے ۔۔۔ غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا ۔۔۔ تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

مناجاتیں آپ نے بہتوں کی سنی ہوں گی ۔ بڑے بڑے عابدوں زاہدوں کی سنی ہوں گی ، اب فریاد اس بیکس و بے بس بے آس اور نامراد دکھیاری کی بھی سنتے چلئے ۔

یہاں نہیں بنتی رنج سہے بن ۔۔۔ رنج نہیں سب ایک سے لیکن
تو ہی کر انصاف اے مرے مولا ۔۔۔ کون ہے جو بے آس ہے جیتا
خواہ دُکھی ہے خواہ سُکھی ہے ۔۔۔ جو ہے اک اُمید اُس کو بندھی ہے
کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی ۔۔۔ آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی
ایک ہے اس اُمید پہ جیتا ۔۔۔ اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
پر نہیں اُٹھ سکتی وہ مصیبت ۔۔۔ آئے گی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اس رہگیر کا کیا دل ۔۔۔ مر کے کٹے گی جس کی منزل
ان اجڑوں کو کل پڑے کیونکر ۔۔۔ گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر

آگے بڑھنے سے قبل ، اگر خدا نخواستہ آپ کے محلہ میں کوئی بپتا کی ماری نوجوان بیوہ ہو تو اس کا تصور ذہن میں جما لیجئے ۔ نوعمری کا زمانہ ، شوخی و شرارت کا ہونا کھیلنا کھانا ، دوڑنا ، بات بات پر ہنسنا ہنسانا ، ماں باپ نے بیاہ کس شوق کس خوشی سے رچایا ۔ ہاتھوں پیروں میں مہندی لگی ، نئے نئے بیاہ کے جوڑے ، نئے نئے زیور گہنے طرح طرح کی رنگینیاں ، نت نئی شوخیاں ، دل میں کیسے کیسے ارمان بھرے ہوئے ، نظروں میں کیا کیا نقشے جمے ہوئے ! اتنے میں یک بیک یہ سب غایب ، سارا منظر محض خواب و خیال ۔ یہ ہاتھ اب عمر بھر چوڑیوں

کو ترسیں گے۔ یہ کپڑے اب کبھی خوشبو سے آشنا نہ ہوں گے خوشبو کیسی رنگین کپڑے تک اب نصیب نہ ہوں گے۔ دنیا اپنے عیش کے کاروبار میں معروف، محلّہ اور برادری میں شادیوں کی دھوم ہیں، خاص اپنے گھر میں برسات کی ملاریں۔ جھولے پڑ رہے ہیں کھیل پر کھیل ہو رہے ہیں۔ ساتھ کی کھیلنے والیاں ساتھ کی مانگی بیاہی ہوئیں نئی نئی ساڑیاں باندھے شوخ رنگ کے بلاؤز پہنے، کیسے کیسے طرحدار دوپٹے اوڑھے، آنکھوں کے سامنے کوئی ہنس رہی ہیں کوئی دوڑ رہی ہیں اور ایک یہ مصیبت کی ماری ہے کہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے ؎

آئیں بہت دنیا میں بہاریں — عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے — ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں — برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی — وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا یاں نام ہے دنیا — جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
حکم سے تیرے پر نہیں چارا — کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
تجھ سے کہیں گر ہا گنا چاہیں — بند ہیں چار دن کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور نوازے — پڑی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں — تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

سہیلیاں زیوروں سے لدی ہوئی ہیں، کس شوق سے کس چاؤ سے ایک دوسرے کو اپنے اپنے زیور دکھائے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں میں مہندیاں رچی ہوئی ہیں۔ پھولوں کے گہنے سر اور گلے کو زینت دئے ہوئے ہیں۔ نازک نازک پنڈے عطر کی خوشبوؤں سے مہک رہے ہیں۔ کہیں ذکر میاں کی چاہ پیار کا ہو رہا ہے، کہیں تذکرے سسرال کی نازبرداریوں کے ہو رہے ہیں۔ کہیں

کسی پر فقرے کسے جا رہے ہیں۔ قہقہوں کا غل ہے رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں اور ادھر ایک بیچاری اللہ کی بندی ایسی ہے جس کے ہاتھ بھی ننگے اور کان بھی۔ جسم رنڈاپے کی سفید چادر سے چھپا ہوا اس کا بھی آخر وہی ہے۔ کیا اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں رہا ہے؟ اس کا قلب امنگوں سے، حوصلوں سے ولولوں سے خالی بنا یا گیا ہے؟ کیا اس دُکھیاری کا جی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کا بھی ناز بردار ہوتا؟ یہ بگڑتی اور کوئی مناتا۔ یہ فرمائشیں کرتی اور کوئی دل و جان سے انھیں پوری کر کرکے دیتا؟ روتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے ؎

اے میرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
رہ نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو رو دل کہاں تک
دن بھیانک اور رات ڈرانی — یوں گزری ساری یہ جوانی
بہنیں اور سہیلیاں میری — ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے — خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ — جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ
آگ کھلی نہ دل کی نہ کسی پر — گھل گئی جان اندر ہی اندر
تہواروں کا آئے دن آنا — اور سب کا تہوار منانا
وہ جیٹھ اور پھاگن کی ہوائیں — وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں — وہ ارمان بھری برساتیں

کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں — خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں
رہ گیا دے کر چاند دکھائی — چاند ہوا پر عید نہ آئی
رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا — بادل گرجا اور مینہ نہ برسا
ریت میں ذرے دیکھ چمکتے — دوڑ پڑی تی میں جھیل سمجھ کے

حسرت نصیب اپنے دن ہین کو دیکھتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھ کر دو جاتی ہے، پھر ملک مالک کرانے اسی مالک دو ولی سے کچھ عرض کرنے لگتی ہے:۔
جوگن کی اس کی آواز میں وہ عابدوں اور زاہدوں کو بھی کہاں نصیب؟ عمر بھر کے مجاہدے ایک طرف، اور ایک گھڑی کی یہ شکستگی، بے چارگی، یہ اپنی بندگی کا مشاہدہ دوسری طرف۔ کہتی جاتی ہے اور سننے والوں کے دل ہلائے لرزائے دیتی ہے ؎

اے دین اور دنیا کے مالک — اے راجا اور پرجا کے مالک
سب پہ کھلا ہے در رحمت کا — برس رہا ہے مینہ نعمت کا
سب کو تیرے انعام تھے شامل — میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
اگر کچھ آتا بانٹ میں میری — سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نون کو ترسی میں سانبھر میں
پہر دن یہ سوچتی ہوں جی میں — آئی تھی میں کیوں راس نگری میں
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں
قسمت نے جب سے منہ موڑا — آدمیوں کا ہو گیا توڑا
تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی
کوئی نہیں لاگو اب میرا — باپ نہ بھائی ساس نہ سسرا

شاعر کی تخیل آرائی نہیں ہے واقعات لکھ رہا ہے اپنے زمانے کے واقعات ومشاہدات ۔ کہتے ہیں کہ شاعر نہ ہے جو جھوٹ کو سچ بنا کر دکھائے حالانکہ شاعری کا سب سے بڑا کمال واقعہ نگاری ہے، مشاہدات سے واقعات سے بڑھ کر مؤثر اور کون شئے ہو سکتی ہے ؎

رو ئے تو سب پڑتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو — کیوں کر الٰہی کاٹئے غم کو
مہندی میں نے لگانی چھوڑی — پٹی میں نے جانی چھوڑی
کپڑے پہنوں میں اوں بدلتی — عطر نہیں میں پھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی — بال نہیں برسوں گندھواتی
رو رو نہ چاند نہیں سر دھوتی — اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی
کان میں پتے ہاتھ میں کنگن — پہن چکی سب جب تھی سہاگن
آپ کو یاں تک میں نے مٹایا — پر دنیا کو صبر نہ آیا
وہ ہم نے ہے اک ایک کو گھیرا — جب دیکھو تب ذکر ہے میرا

ان دکھیاریوں پر جو ظلم ابھی ایک نسل اُدھر تک عام تھے بلکہ کہیں کہیں اب بھی جاری ہیں کس اوبھیڑ سن والے کے علم میں نہیں؟ کن بُرانی آنکھوں نے وہ جگر خراش منظر نہیں دیکھے ہیں؟ اُس وقت کے کس کان نے وہ فریادیں نہیں سُنی ہیں؟ یہ زور دو تھا، جب کسی بیوہ کے عقد کا نام لینا ہی ہمسایہ قوم کی نہ دیکھا دیکھی، خود مسلمانوں میں خاندان کی ناک کٹ جانے کے مُرادف قرار پا چکا تھا۔

آن پر مٹ جانے والی شرافت پر جان دے دینے والی، کمسن، بیوہ، اپنا عزت پر گواہ آسمان کے چھٹکے ہوئے تارے اور گھر کے در ودیوار ان سب کو لاتی ہے ؎

اے ابر کے چمکتے ہوئے تارو — اے گھر کے درا اور دیوارو
اے جانی پہچانی راتو — تنہائی کی ڈرانی راتو
ایک دن اس گندی دنیا سے — جانا ہے مالک کے آگے
جب وہاں پوچھ ہو میری تیری — تم سب نرکچھ گواہی میری
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی — پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی
پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی — منہ پہ آئے بن نہیں رہتی
خواہ بری تھی خواہ بھلی ہیں — بات سے اپنی نہیں ٹلی میں
ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا — اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
اے ایمان کے رکھنے والے — اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے — چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر میں — چین سے کرتی عمر بسر میں
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی — مرضی غمخواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے — قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
جان کسی کی جائے تو جائے — آن میں اپنی فرق نہ آئے
تجھ پہ ہے روشن اے میرے مولیٰ — وقت یہ کیا مجھ پہ پڑا تھا
آن سنبھالے جان تھی جاتی — جان بچائے آن تھی جاتی
طے کرنے تھے سات سمندر — حکم یہ تھا ہاں پانوں نہ ہو تر
جان نہ سمجھا جان کو اپنی — دیا نہ جانے آن کو اپنی
اے اچھے اور برے کے بھیدی — کھوٹے اور کھرے کے بھیدی
بھیدوں کے جاننے والے — پاپ اور پن کے چھاننے والے
عیب اور گن سب تجھ پہ ہیں روشن — پاپ اور پن سب تجھ پہ ہیں روشن

کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو　　جن جن پر تھا یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا　　سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
روک کے اور یوں تھام کے آیا　　میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا
تو ہے مگر اس بات کا دانا　　میں نے کہا دل کا نہیں مانا
تھامنا دل کا کام تھا میرا　　اور تھمانا — کام تھا تیرا
پکڑے اگر تو دل کی خطا پر　　میں راضی ہوں تیری رضا پر

اپنی تو خیر جیسی بھی گزری گزر گئی، اب دھیان ہے تو اس کا کہ اور بہت سی بہنوں پر بھی یہی وقت پڑا ہوا ہے، ان بیچاریوں کی تو مشکل کسی طرح آسان ہو، بندی اپنے چاہنے والے مالک اور مولیٰ سے کہتی ہے ؎

اے غم خوار ہر ایک بیکس کے　　حامی ہر عاجز بے بس کے
ہے اپنے عاجز بندوں پر　　پیار تیرا ماں باپ سے بڑھکر
جس نے لگنی میں تجھ کو پکارا　　سامنے تیرے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے　　گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
گھر بسنے کی آس نہ رہنی　　ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے　　بپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے　　یا جس پر گزری ہو وہ جانے
اے خاوند خداوندوں کے　　مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خاوندی کا　　صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو　　کسی کو بے وارث مت کیجو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا　　کرا سے تو پیوند زمیں کا

یا عورت کو پہلے بلا نے یا دونوں کو ساتھ اُٹھا لے

اس سوز دل سے نکلی ہوئی دعائیں کہیں رائیگاں جاسکتی تھیں؟ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے اس ۵۰، ۶۰ سال کے عرصہ میں ہندوستان میں رانڈوں کی بپتا تقریباً دور ہی ہوگئی ہے اور کچھ اصلاح بڑی حد تک ہمسایہ قوم میں بھی ہوکر رہی ہے،

خاتمہ پر واعظ شاعر نے وہی کہا ہے جو آج تک سارے واعظ اور سارے حقیقی شاعر برابر کہتے چلے آئے ہیں۔ کیسی بیوگی اور کہاں کا سہاگ نہ اس کو قیام نہ اُس کو ثبات، ساری لذتیں فانی اور سارے عیش آنی۔ کسی کی پھولوں کی سیج پر لیٹ کر گذری تو کیا اور کسی نے کانٹوں پر لوٹ لوٹ کے کاٹی تو کیا۔ بشریت کا تقاضا تھا جو زبان پر اتنی بھی حکایت و شکایت آگئی، پیار ہو تو اسی من موہن کا جسے کبھی فنا نہیں، دل میں لگن ہو تو اسی ایک کی جس کا عہد کبھی ٹوٹنے والا نہیں، جس کی خانہ ندی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ بیوہ کی یہ مناجات واعظ شاعر کی وعظ گوئی اور شاعری دونوں کا نچوڑ ہے ؎

دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا — سکھ پہ یہاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی — سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی
آنی جانی جنہر ہیں خوشیاں — چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں
منگنی بیاہ برات اور رخصت — میل ملاپ سہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے — آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے
خواہ ہو رانڈ اور خواہ سہاگن — موت ہے سب کی جان کی دشمن

ایک ہے گو آج ایک سے بہتر — مر گئیں جب دونوں ہیں برابر
اور کوئی گر انصاف سے دیکھے — مر کے اسے نسبت نہیں اس سے
عیش گئی وہ چھوڑ کے یاں کے — قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کو ٹری کل اُس کی گئی کل — یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل

شاعر کا آخری پیام وہی ہے جو عارفوں کا ہمیشہ رہا ہے، یہ سوز بھی اگر کسی دل میں آگ نہ لگا سکے تو یقیناً وہ دل نہیں ہے پتھر کا ٹکڑا ہے۔

تیرے سوا یاں اے مرے مولیٰ — کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
پڑی تھی سونی جب یہ نگریا — تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
چاہتی ہوں اک تیری محبت — اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے — تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں — کوئی رہے ارمان نہ جی میں
دل میں لگن بس اپنی لگا دے — سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
وہاں سے اکیلی آئی ہوں جیسی — ویسی ہی یاں سے جاؤں اکیلی
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا — کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشاں یاروں کا مٹا دوں — پیار کے منہ کو آگ لگا دوں
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر — مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے ایک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

یہ مناجات تو وہ ہے کہ اگر مناسب ماحول میں پڑھی جائے تو عجب نہیں جو زردیوار بھی جھوم جھوم کر اپنی بولی میں اس پر آمین کہہ اُٹھیں پھر انسان کا دل تو آخر انسان ہی کا دل ہے!!

---

(۴)

پریم چند[1]

الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کے دور اقبال کا آفتاب جب غروب ہونکو آیا اور بوستان خیال اور طلسم ہوشربا کے دفتر جب زمانے کے ہاتھوں داخل دفتر ہونے لگے تو" صاحب" کے قدموں کی برکت سے ایک نئی دنیا دلوں اور دماغوں کی، خیالات اور جذبات کی سرزمین ہند میں آباد ہونے لگی۔ اور اس دیس کے لوگ ایک نئی چیز اور نئے نام "ناول" سے آشنا ہونے لگے "طلسمات" کی جگہ اب سین اور سینری "کوہ قاف" کی جگہ شہر کی گلیاں اور بالاخانے "شہباز نگر" کی جگہ پلاٹ، دیوؤں اور شہزادوں کی جگہ" ہیرو" اور پریوں اور شہزادیوں کی جگہ ہیروئن !

شاگرد نے استاد کے منہ سے نکلے ہوئے اکھر گرہ میں باندھ لیے اور خود بھی وہی بولنا اور وہی سوچنا وہی لکھنا اور وہی پڑھنا شروع کر دیا جس کے سبق اسکول اور کالج میں پڑھے تھے اردو میں ناول چھپنے لگے اور بکنے

[1] تحریر ۱۹۳۶ء . نظر ثانی ۱۹۵۵ء

لگے لکھے جانے لگے اور پڑھے جانے لگے، اور ناول بھی ہر رنگ کے ہر ڈھنگ کے۔ کوئی تاریخی اور کوئی محض خیالی۔ کوئی معاشری اور کوئی اصلاحی، پیسہ اخبار اسٹریٹ کی طرف جا نکلئے تو "جاسوسی" بھی اور ادب لطیف کے ضلع میں آجایئے تو "قاموسی" بھی! سر تا سر شار اپنے اپنے فن میں استاذ ناول نویسوں کے لشکر کے علمبردار اور پیچھے چلنے والوں کی تعداد بے شمار!

بات میں بات نکلتی ہے اور شاخ سے شاخ۔ بڑے ناول تو کتابی صورت کے لیے مخصوص رہے۔ ان کے ولیعہد، مختصر افسانے پیدا ہوئے اور وہ رسالوں اور ماہناموں میں نکلنے لگے بازار میں ان کی مانگ بھی خوب رہی اور ناول اور مختصر افسانے علم و ادب کی شاخ تو کسی ایک ہی آدھ کے لیے رہے البتہ ایک پر منفعت تجارت اور کامیاب کاروبار بہتوں کے لیے بن گئے ــــ لیکن ان سب میں ہوتا کیا تھا؟ ناول ہو یا "شارٹ اسٹوری" عام ذہنوں کے سامنے ان کا مفہوم تھا کیا! وہی حسن و عشق کی پرانی داستان وہی لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد کی ہزار ہا مرتبہ کی دہرائی ہوئی کہانی جو لاکھ پرانی ہونے پر بھی اب تک پرانی نہیں ہوتی ہے ؎

یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پرانا ہرگز

بس یہی کہ فلاں کی آنکھ فلاں سے لڑگئی۔ فلاں فلاں کے ساتھ نکل گئی۔ اس کی عصمت یوں لٹی آس آبرو یوں بچی۔ کسی کے لب پر آہ سوزاں کسی کے جگر میں زخم بیکاں۔ یہ اس پر مفتوں۔ وہ اس کے لیے مجنوں۔ ایک اپنی آرزوں اور

---

۵۱ لاہور کا ایک پرانا اور اپنے زمانہ میں بہت ہی مشہور مقبول اخبار "پیسہ اخبار" تھا اس نے جاسوسی ناول بھی کثرت سے اور بڑے ارزاں شائع کیے تھے! ۵۲ "ادب لطیف" جب اول اول اردو میں چلا ہے، تو اس میں لغات کی خوب بھرمار رہتی تھی، "قاموسی" میں یہی تلمیح ہے

تمناؤں میں کامیاب ہوگیا۔ دوسرا ناشاد و نامراد دنیا سے کوچ کر گیا۔ گویا ہر داستانِ حیات، داستانِ نل و دمن اور ہر افسانۂ زندگی افسانۂ شیریں و کوہکن، ناول کی دلکشی کا راز عشق و عاشقی کی گھاتوں میں، اور ناول نویس کے قلم کا اعجاز جوانی کی راتوں میں۔!

کہتے ہیں افسانہ نام ہے ایک مکمل زندگی کی حکایتی تصویر کا لیکن یہاں زندگی مترادف تھی صرف ہجر و وصال کے صرف رُخ و خال کے گویا انسانی زندگی اپنی ساری رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوجود کیا تھی؟ تھیٹر کے اسٹیج کی ایک آہ اور دنیائے عمل اپنی ساری وسعت و پہنائی کے باوجود کیا تھی؟ محفل مشاعرہ کی ایک واہ!

یہ رنگ تھے اور کچھ ایسے ہی ڈھنگ کہ ایک گوشہ سے چپکے سے پریم چند نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کا پلٹ گئے۔ آئے دبے پاؤں خاموشی سے، آتے وقت نہ شور ہوا نہ ہنگامہ لیکن جب گئے تو یاران بزم کا انداز ہی کچھ کا کچھ تھا۔ جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے نہ کسی سے الجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ۔ بات چیت کرتے تو سادہ تر پاتے۔ بس یہ معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبہ کے معمولی سے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اور زیادہ کرید اگر آپ نہ کرتے تو یہ بھی نہ پتہ چلتا کہ ہیں کس مذہب کے۔ رہے اب تک تو دوں رہے اور گئے تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھ کر، صاحب طرز ہو کر، "صاحب" کے محاورہ میں اپنا ایک مستقل "اسکول" چھوڑ کر ــــــ یہ نہیں کہ پریم چند سے پہلے کسی کو عام ڈھرے سے ہٹنے کا خیال ہی نہ آیا ہو مستثنیات کس کلیہ میں نہیں ہوتے۔ اردو میں بھی بعض باکمال یقیناً ایسے گزر چکے تھے جن کا قلم ان بے اعتدالیوں اور رعنائیوں سے بالکل بچ بچ کر چلا۔ اور جو زندگی کو زندگی سمجھے۔ شاعری کا مترادف نہیں سمجھے لیکن ان کی کوششیں اور کاوشیں بس انھیں کی ذات تک

محدود رہیں۔ دریا میں پتھر آگرگرا چکر بنا، تلاطم ہوا، لیکن آناً فاناً سب غایب اور زری دیر میں سطح برابر ۔۔۔ دھارے کا رُخ پھیرنا وہ جتنا کچھ بھی، پریم چند ہی کے نصیب میں آیا۔

پریم چند خود تو اپنی اُردو کتابوں میں بازارحسن کو نمبر اول پر رکھتے تھے۔ لیکن اس کم سواد بے استعداد کا خیال ہے کہ سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی ضخیم کتاب دو جلدوں اور ایک ہزار صفحہ والی چوگان ہستی ہے کہیں سے بھی کھول لیجئے یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے۔ ختم کئے بغیر جی ماننے کا نہیں۔ اُردو اور تصنع کہنا چاہئے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ جو بھی صفحہ اُلٹ کر دیکھئے سادگی، بے ساختگی آمد کے لحاظ سے خطہ گلزار۔ جس حصہ کا بھی انتخاب کیجئے دلکشی، دلآویزی اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونہ بہار۔ جان سیوک نامے بنارس کے ایک دیسی "صاحب" عیسائی مذہب کے شخص ہیں کہ دنیا دار نوجوان لڑکی "سوفیا" کا رجحان ہندو مذہب کی جانب ہو جاتا ہے، ایک موقع پر ماں بیٹی سے دو بدو گفتگو ہو پڑتی ہے، اور درمیان میں لڑکی کے بوڑھے دادا، اور جہاں تک محض ظاہری احکام کا تعلق ہے بڑے دیندار مسیحی ایشور سیوک آجاتے ہیں۔ سب کی سیرتیں ملاحظہ ہوں:۔

"سوفیا۔ میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات کو نہیں مانتی۔

مسز سیوک۔ میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی یہ کہہ کر وہ سوفیا کے کمرے میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اُٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینک دیں

اسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جا کر مسٹر الشور سیوک سے بولیں،
—— پاپا آپ سونی کو ناحق بلا رہے ہیں وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔
مسٹر الشور سیوک۔ ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی گرپڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر کے بولے، کیا کہا سونی! حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ صوفی؟
مسز سیوک۔ ہاں ہاں سونی کہتی ہے مجھے ان کے معجزوں ان کے مواعظ اور الہامات پر اعتقاد نہیں ہے۔
الشور سیوک۔ (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا! کہاں ہے سونی! مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر! میں اس کے پیروں پر گروں گا اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا مجھے اس کے پاس لے چلو!
مسز سیوک۔ میں سب کچھ کر کے ہار گئی اس پر خدا کا قہر ہے میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔
الشور سیوک۔ بیٹی ایسی باتیں نہ کرو وہ میرے گوشت کا گوشت میرے خون کا خون میری جان کی جان ہے! میں اسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسوع نے کافروں کو سینہ سے لگایا تھا سیاہ کاروں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی وہ میری سونیا پر ضرور رحم کرے گا یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔
جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو الشور سیوک لکڑی کے سہارے اُٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے سونیا کے کمرے کے دروازے پر آ کر بولے، بیٹی

سونی کہاں ہے؟ ادھر آبیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں ہمارا یسوع خدا کا دلارا بیٹا تھا، غریبوں کا مددگار کمزوروں کا محافظ مفلسوں کا دوست ٹوٹے دلوں کا سہارا گناہگاروں کا شافع دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا۔ بیٹی! ایسا اور کون سا نبی ہے جس کا دامن اتنا وسیع ہو جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں ساری برائیوں کے لیے جگہ ہو وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو کافروں کو گناہ گاروں کو نجات کا مژدہ دیا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لیے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچانے والا کون تھا؟ یہ کہتے کہتے انھوں نے "سوفیا" کو گلے سے لگالیا۔"

یہ ساری گفتگو اول سے آخر تک کتنی سچی اور کیسی مطابق واقعہ ہے صرف آخری ٹکڑے میں ذری سی لغزش ہو گئی ہے جہاں حضرت مسیح کو ایک مسیحی کی زبان سے خدا کا نبی کہا ہے۔ یہ عقیدہ اسلامی ہے، مسیحی نہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک تو خدا کے اکلوتے بیٹے کو نبی کہنا اس کی توہین کرنا ہے لیکن ایسی خفیف لغزشیں افسانہ میں اور بھی محض ضمناً قابل اعتنا نہیں۔

انھیں مس "سوفیا" پر ضلع کے انگریز نوجوان کلکٹر مسٹر کلارک کا دل آجاتا ہے اور کورٹ شپ شروع ہو جاتی ہے۔ صاحب بہادر مع سوفیا کے ایک بڑی ریاست جسونت نگر میں مہمان ہیں۔ یہیں جیل میں مشہور محب وطن اور رئیس زادہ ونے سنگھ، "سوفیا" کا دل سے چاہنے والا قید ہے۔ سوفیا بھی حقیقتاً دل سے اسی کی طرف مائل ہے۔ کلکٹر کے ساتھ محض مصلحتاً نباہ کر رہی ہے، دیوان ریاست سردار نیل کنٹھ مہمانداری کی خدمات کے لیے وقف ہیں۔ سوفیا جیل میں ونے کو دیکھ اپنا اشتیاق پورا کرنا چاہتی ہے اور اس لیے جسونت نگر میں ابھی اور ٹھہرنا ضروری ہے اس کے بعد اصل گفتگو اب خود سُنئے:-

"شہر کا گشت کر کے سوفیا مسٹر کلارک، سردار نیل کنٹھ اور دو ایک اعلیٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہو گئے۔ میز پر چاء لائی گئی مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنھیں شراب کی بو سے نفرت تھی کھسک کر سوفیا کے پاس جا بیٹھے اور بولے۔ جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

سوفیا: نہایت پُر فضا مقام ہے پہاڑیوں کا منظر نہایت دلفریب ہے شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی سے جی خوش ہو گیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں۔

نیلکنٹھ ڈر گئے ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُر امن رکھا جا سکتا ہے مگر ہفتے دو ہفتے تک کسی طرح بھی بالکل نا ممکن ہے۔ کہیں یہ لوگ ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہو جائے گی نہ جانے اسکا کیا انجام ہو۔ بولے یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آیئے آب و ہوا بہت خراب ہے آگے جا کر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے:

سوفیا۔ کچھ ہی ہو میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی کیوں ولیم تمھیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک۔ تم یہاں رہو تو میں دفن ہو جانے کو تیار ہوں۔

سوفیا۔ لیجئے سردار صاحب ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

سوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

نیلکنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے آب و ہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بد امنی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں۔

سوفیا۔ جب تو ہمارا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سنی گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لیے ان سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے سوفیا نے انھوں نے یہ بات بے خوف ہو کر کہہ دی تھی۔ اس کی منکسر مزاجی سے انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میری نذر و نیاز نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ کچھ بے تکلف ہو گئے تھے یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چوندھیا گئیں التجا کے لہجہ میں بولے :- میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتی الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا خیال نہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ زہر کے قطرے سنہرے برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے والنٹیروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا ہمیں خبر تک نہ ہوئی ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جا سکتی ہے مگر سادھوؤں سے نہیں۔ رضا کاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بے خوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اتارنے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا نہایت شریر طبیعت کا آدمی ہے ہم لوگوں کی نیند حرام ہو گئی ہر لمحہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی۔ ونے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہو گیا مگر اس کے دیگر رفقا ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے کئی بار دونے کو نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی جا چکی ہے اور ملازمین کو ہمیشہ اپنے جانوں کا خوف بنا رہتا ہے ـــــ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا۔ میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز نہ دوں گا اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں

نے جو کچھ کیا اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

سوفیا نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ واقعی حالت اس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائم مقام ہو کر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں۔ کیوں ولیم تمھیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔

کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا: تمھاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کر سکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا وہ تمھارا کام ہے۔ مس کنٹھ۔ میری آپ سے مؤدبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لیے کچھ اور وقت لیجئے، آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لیے مضر ہوگا۔

اقتباس طویل ذرا زیادہ ہوگیا۔ لیکن باہنر مصور کی ہنرمندی کے نمونے دکھانے میں بخیل بھی کہاں تک روا رکھا جائے، ریاستوں کی، بے بسی، میم صاحب کی ذہانت و ذکاوت اور سب سے بڑھ کر صاحب بہادر کے بے پناہ اختیارات کی ہمہ گیری، ہر شئے ان میں سے اپنے اپنے موقع پر کیسی بڑی اور کیسی جڑی ہوئی ہے! اسی کا نام ہے قلم کی مرصع کاری!

بات ذرا آگے ہوئی جاتی ہے لیکن کلکٹر صاحب کی اس خدائی پر اکبر کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا۔ لیجئے ہم مذہبوں کے سامنے، خدا تعالیٰ کی قدرت کا وعظ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ دشمن کو طول کہاں تک دو، بس یہ سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کو وہ اختیارات حاصل ہیں جو صاحب کلکٹر بہادر کو ہوتے ہیں (نعوذ باللہ)

اسکی قدرت کہاں تک میں کروں تم سے بیاں   میں تو اللہ تعالیٰ کو کلکٹر سمجھا

"کہاں تک" کی بلاغت قابل داد ہے۔ شاعر بیان کرتے کرتے تھک گیا ہے آخر میں مختصر اور جامع مثال اسے کلکٹر ہی کی نظر آتی ہے۔

شہری زندگی کی نقاشی بہتوں نے کی ہے اسکول اور کالج میں، پارک اور چمن میں، کچہری میں اور اسٹیشن پر سب ہی گھومے پھرے ہیں۔ کھیت کی مینڈوں پر کوئی کم ہی چلا ہے۔ دیہات کے چوپالوں میں، اہیروں اور مچھیروں کی جھونپڑیوں میں کم ہی کسی کے قدم گئے ہیں۔ پریم چند کے قلم کا اصلی جولانگاہ یہی ہو۔ فن کے دوسرے لوازم میں تو ان کے نظیر مل بھی جائیں گے۔ لیکن جہاں تک دیہاتی زندگی کی مصوری کا تعلق ہے اب تک تو پریم چند کے جوڑ کا کوئی نظر نہیں پڑا۔ دیہات کے جس جس منظر کا سماں کھلاتے ہیں اسے دور سے بتلاتے نہیں گویا اٹھا کر وہیں پہونچا دیتے ہیں۔

ایک گانوں ہے اور برسات کا موسم کہ اتنے میں موضع کے زمیندار ٹھاکر صاحب وہاں دورہ فرماتے ہیں۔ گانوں کی لہلہاہٹ اور ٹھاکر صاحب کی مہربانی دونوں ملاحظہ ہوں:۔

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے گانوں کی بوڑھی بنیائن نولی دلہن بنی ہوئی تھی اور فاقہ کش کمہار بارات کا دولہا تھا مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے ٹپکتی ہوئی چھتیں ان کے نگاہ کرم کی منتظر۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت ان کے دست شفقت کے محتاج جسے چاہتے تھے بساتے تھے جسے چاہتے تھے اجاڑتے تھے، آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو بانز پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پر مزہ شغل تھا، نالے پُرشور، ندیاں اتھاہ، چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت کا حسن بسیط۔ انھیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گانو میں آ گئے۔ ایک سجی ہوئی بارات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور ساز و سامان۔ لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ۔ گانوں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کر و فر دیکھا تو رہے سہے ہوش اڑ گئے گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور گنڈے گلیوں میں:

دوسرا منظر :-

"دوسرا ساڑھا آیا تو وہ گانوں پھر رشک گلزار بنا ہوا تھا۔ بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیئے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے،

سال بھر اور گزر ا جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالیوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے، مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے، اور داروغہ جی کی مسرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آیند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے مذہبی تزک و احتشام مذہبی لٹھیتوں کا رسالہ مذہبی گنندوں کی فوج! گانوں والوں نے ان کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا لکڑی کے انبار لگا دیئے دودھ کے حوض بھر دیئے ٹھاکر صاحب گانوں کے میڈے پر پہونچے تو پورے ایک سو آدمی ان کی پیشوائی کے لیے دست بستہ کھڑے تھے "

چوگان ہستی میں اگر کمال یہ تھا کہ پلاٹ کی بندش، اتنی طوالت و ضخامت کے باوجود کہیں سے سست نہیں ہونے پائی۔ اور دل آویزی میں خلل پڑنے کا کوئی لمحہ نہ آنے پایا تو یہ چھوٹے چھوٹے افسانے بھی جن کے مجموعے کا نام پریم پچیسی ہے اور اس کی بھی دو جلدیں ہیں اور اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملوں میں عجیب موہنی ہے ہر ہر فقرہ گویا موتیوں کی لڑی! فریب نظر کی حد یہ ہے کہ آپ خود اپنے متعلق دھوکے میں پڑ جاتے ہیں" یہ یاد نہیں رہ جاتا کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے اور آپ کسی کی سرگزشت پڑھ رہے ہیں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ یہ تو خود ہمارے ہی اوپر سب گزرتی چلی جا رہی ہے بچے بھی ہیں۔ بوڑھے بھی ہیں۔ ہمیں ظالم بھی ہیں

مظلوم ابھی ہنس بھی ہم ہی رہے تھے ابھی رونے بھی ہم ہی لگے ۔ تماشائی کی حیثیت غائب ، تماشا ہم خود

شرافت ان کی تحریر کی جان ہے اور پاکیزگی ان کے قلم کا ایمان ۔ منظر کیسا ہی گندہ ہو ان کی نظر انتخاب ہمیشہ انھیں عنصروں کو چن لیتی ہے جو نفس کو نہیں روح کو تڑپائیں جذبات کے سفلی نہیں علوی حصے کو گرمائیں اور بدی کی نہیں نیکی کی قوت کو حرکت میں لائیں ۔

سُمن ایک شریف ہندو گجادھر پرشاد کی بیوی ہے پڑوس میں رام بھولی ایک بازاری عورت آکر رہتی ہے بچپن کی بات سُمن کے کان میں پڑی ہوئی ہے کہ بیسواؤں کا پیشہ ہی ذلیل ہے اور کوئی بھلا آدمی ان کی طرف رخ بھی نہیں کرتا ۔ اب اپنی آنکھ سے جو کچھ دیکھتی ہے اس پر اسے اچنبھا ہو کر رہ جاتا ہے اور نفس کی نظروں میں اگر بدی سر تا سر خوشنما نہیں نظر آنے لگتی ہے تو کم از کم بیشتر کی سی بدنما اور گھناؤنی تو یقیناً نہیں باقی رہ جاتی ۔

" سُمن کے مکان کے سامنے بھولی نام کی ایک طوائف کا مکان تھا بھولی نت نئے سنگار کر کے اپنے بالاخانے کے جھروکے پر بیٹھا کرتی پہر رات تک اس کے کمرہ سے نغمۂ خوش آیند کی صدائیں آیا کرتیں کبھی کبھی وہ فٹن پر سوار ہو کر ہوا کھانے جایا کرتی سُمن اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی ۔

سُمن نے سُن رکھا تھا کہ طوائفیں بہت ہی ذلیل اور بدکار ہوتی ہیں وہ اپنے ناز اور انداز سے نوجوانوں کو اپنے دام محبت میں پھنسا لیا کرتی ہیں ۔ کوئی شریف آدمی ان سے بات چیت نہیں کرتا محض شوقین لوگ رات کو چھپ کر ان کے یہاں جایا کرتے ہیں بھولی نے کئی بار اسے چق کی آڑ میں کھڑے دیکھ کر اشارہ سے بلایا تھا ۔ پر سُمن اس سے بولنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی میں غریب سہی پر اپنی عصمت پر تو قائم ہوں

کسی شریف آدمی کے گھر میں میری روک تو نہیں ہوتی طوائف کتنا ہی عیش و آرام کرے پر اس کی کہیں عزت تو نہیں ہوتی بس اپنے کوٹھے پر بیٹھی اپنے بے شرمی اور اپنی بے حیائی کا سوانگ دکھایا کرے لیکن سمن کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اسے حقیر سمجھنا میری غلطی ہے!

اساڑھ کے دن تھے گرمی کے مارے سمن کا دم گھٹ رہا تھا شام کے وقت اس سے اندر نہ رہا گیا اس نے چق اٹھا دی اور دروازے پر بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی تو کیا دیکھتی ہے کہ بھولی بائی کے دروازے پر کسی تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں بہشتی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے صحن میں ایک شامیانہ تانا جا رہا تھا شیشہ آلات ٹھیلوں پر لدے چلے آتے تھے فرش بچھایا جا رہا تھا بیسوں آدمی ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اتنے میں بھولی کی نگاہ سمن کی طرف اٹھی قریب آکر بولی آج میرے یہاں مولود ہے دیکھنا چاہو تو پردہ کرا دوں؟ سمن نے بے پروائی سے کہا " میں یہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لوں گی "

بھولی۔ دیکھ تو لوگی پر سُن نہ سکوگی ہرج ہی کیا ہے اوپر پردہ کرا دوں!

سمن۔ مجھے سننے کی اتنی خواہش نہیں ہے۔

بھولی نے اس کی طرف نگاہ ترحم سے دیکھا اور دل میں کہا یہ گنوارن شاید دیہات سے آئی ہے اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھے بیٹھی ہے۔ اچھا آج تو دیکھ لے کہ میں کون ہوں۔ اس نے زیادہ اصرار نہ کیا رات ہو رہی تھی جو لطف کی صورت دیکھ کر سمن کی روح کانپ رہی تھی۔ پر طوعاً و کرہاً اٹھی جوں توں طلایا۔ کھچڑی ڈالی اور دروازے پر آکر تماشا دیکھنے لگی آٹھ بجتے بجتے شامیانہ گیس کی روشنی سے گنبد نور بن گیا پھول پتوں کی آرائش سونے پر سہاگہ تھی تماشائی چاروں طرف سے آنے لگے کوئی بائیسکل پر آتا تھا کوئی ٹمٹم پر کوئی پیدل تھوڑی دیر میں دو تین فٹن بھی آ پہونچی ایک گھنٹہ میں سارا صحن بھر گیا اس کے بعد مولانا صاحب تشریف لائے ان کے چہرے سے اک جلال برستا تھا اور وہ آراستہ تخت پر مسند لگا کر آ بیٹھے اور مولود شروع ہو گیا کئی آدمی مہمانوں کی تواضع و تکریم کرنے

لگے کوئی گلاب چھڑکتا تھا کوئی خاصدان پیش کرتا تھا سمن نے شرفا کی ایسی مجلس کبھی نہ دیکھی تھی۔

نو بجے گجادھر پرشاد آئے سمن نے انھیں کھانا کھلایا گجادھر کھانا کھاکر اسی مجلس میں شریک ہو گئے اور سمن کو تو کھانے کی سدھ ہی نہ تھی گیارہ بجے رات تک وہ وہیں بیٹھی رہی پھر شیرینی تقسیم ہوئی اور بارہ بجے مجلس ختم ہو گئی گجادھر گھر میں آئے تو سمن نے کہا "یہ سب کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے"؟

گجادھر۔ میں سب کو پہچانتا تھوڑے ہی ہوں، بھلے برے سبھی ہوں گے شہر کے کئی رئیس بھی تھے۔

سمن۔ کیا یہ لوگ ایک طوائف کے گھر آنے میں اپنی توہین نہیں سمجھتے؟

گجادھر۔ توہین سمجھتے تو آتے ہی کیوں؟

سمن۔ تمھیں تو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی ہوگی!

گجادھر۔ جب اتنے شرفا بیٹھے تھے تو مجھے شرم کیوں آنے لگی، وہ سیٹھ جی بھی آئے تھے جن کے یہاں میں شام کو جایا کرتا ہوں۔

سمن نے پرخیال انداز سے کہا "میں سمجھتی تھی کہ ان عورتوں کو لوگ بہت ذلیل سمجھتے ہیں،

گجادھر۔ ہاں ایسے لوگ بھی ہیں پر گنے گنائے۔ انگریزی تعلیم نے لوگوں کو آزاد بنا دیا ہے بھولی بائی کی شہر میں بڑی عزت ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ہوا بالکل بند تھی گجادھر پرشاد دن بھر کے تھکے ہوئے تھے چارپائی پر جاتے ہی سو گئے پر سمن کو نیند نہ آئی، دوسرے دن شام کے وقت جب وہ پھر چق اٹھا کر بیٹھی تو اس نے بھولی کو چھجے پر بیٹھے دیکھا۔ وہ برآمدہ سے نکل کر خود بھولی سے بولی "رات تو آپ کے یہاں بڑی دھوم تھی"۔

بھولی سمجھ گئی کہ میری فتح ہوئی مسکرا کر بولی۔ تمھارے لیے شیرینی بھیجدوں حلوائی کی بنائی ہوئی ہے اور برہمن لایا ہے،

سمن نے شرماتے ہوئے کہا "بھجوا دیجئے گا"۔

ہماری معاشرت جس طرح شیطان کی اعزازی ایجنٹ بنی ہوئی ہے اس کی تصویر اس سے بڑھ کر لطیف بھی اور تیر درد بھی اور کیا ہوگی؟ لوگ قصے کہانیوں کو محض لطف و تفریح کے لیے پڑھتے ہیں لیکن اس لطف کے ساتھ ہی ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو، بدی کی مخفی راہوں کا علم، شیطنت کی خفیہ چالوں کا احساس، وطنیت کا صحیح جذبہ، ایثار، اخلاص اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار گولیاں پریم چند ہی کے دواخانہ میں دستیاب ہوں گی۔ اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کے آئندہ مورخ کو جس طرح گاندھی، نہرو، محمد علی، ابو الکلام، کی تحریروں کی ایک ایک سطر کی چھان بین ناگزیر ہوگی اسی طرح پریم چند کے بھی افسانوں کو الٹ پلٹ کئے بغیر کام نہ چلے گا۔

---

(۴)

نیا[۱] آئینِ اکبری

آئینِ اکبری تو وہی ایک ہے سب کا جانا ہوا خوب سا پہچانا ہوا شہنشاہ اکبر کے
انتظامی خط و خال کا آئینہ اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کرے گا پرانے کو نیا کوئی کیونکر
بنائے گا، دورِ طلسم میں گزری گھڑی کے ٹوٹنے کا پیوند کہاں سے لاکر لگائے گا؟ — لیکن اکبر اکیلے
ایک شہنشاہِ ہند ہی کا تو نام نہیں ہوا ہے اقلیمِ سخن کا بھی ایک تاجدار اسی نام کا گزرا
ہے صدیوں قبل نہیں ابھی حال میں۔ اور کہیں بہت دور نہیں آپ کے شہر سے نزدیک،
الٰہ آباد میں! وہ قدیم آئینِ اکبری تھا اقلیمِ ہند کے ایک فرماں روا کا گویہ جلالی۔ یہ آج
کا جدید آئینِ اکبری ہے اقلیمِ معانی کے ایک تاجدار کا پرتوِ جمالی! البتہ وہاں داستان گو
تھا ایک امام کا ابوالفضل؛ اور یہاں عرض پرداز ہے ایک سراپا جہل! — خیر نمائش[۲]
کے عجائب زار میں ایک عجوبہ کا اضافہ اور سہی! ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں

---

۱ تحریر ۱۹۳۶ء ۔ نظرِ ثانی ۱۹۵۳ء

۲ یہ مقالہ اول بار ہندوستانی اکیڈمی کانفرنس کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اُس وقت لکھنؤ میں
ایک بہت بڑی سرکاری نمائش ہو رہی تھی اور اکیڈمی کانفرنس کا اجلاس بھی نمائش گاہ کے اندر ہو رہا تھا

کے مجمع میں سخن گویوں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد قصاتی کی یہ جسارت اللہ اکبر!
بس سمجھئے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کی لگ رہی
ہوں وہیں ایک گوشہ میں ایک نعلبند بھی کیل کانٹے سے لیس، اپنا تھیلا لیے موجود!
ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب
سے گہری نقاب بھی۔ یہ بالکل صحیح کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا اور ان کی شہرت کو
تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح کہ دنیا انھیں محض ایک دل لگی باز سمجھ ان کے
لطیفوں پر مٹی رہی ان کی شوخیوں پر ہنستی مسکراتی۔ ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ
گئی، اور نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں، کہ جس ساز
سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے! یہ سب نے دیکھا کہ
ایک پیر مرد شکر لپٹی ہوئی گولیاں سب کو تقسیم کرتے جاتے ہیں اور کھانے والے ہیں کہ
فرط لذت و حلاوت سے ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ کسی نے نہ پوچھا کہ گولیاں
جراثیم کش کیسی زبردست ہیں اور ان میں تریاق قیمت کس غضب کی ہے! دستانے
اگر نرم اور گدازمخمل کے ہیں تو کسے پڑی ہے، جو ٹٹول ٹٹول کر دیکھے کہ اندر پنجہ گوشت
پوست کا نہیں فولاد کا ہے! صاحب مثنوی مولوی معنوی کے اس رمز سے تو سب ہی
آگاہ ہیں کہ وہ "سر دلبراں" حدیث دیگراں" میں ادا کرتے جاتے ہیں۔ حضرت اکبرؒ نے
بھی کچھ سوانگ اسی طرح کا بھرا۔ اور جو کچھ زمانہ کے کڑے تیوروں کے لحاظ سے کھل کر
نہ کہہ سکے اسے قہقہوں کے شور اور تالیوں کی گونج میں سنا گئے اور معذرت خواہی یہ کرتے
گئے ؎

سبز موسم ہے، ہوائیں چل رہی ہیں برقرار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے ہیں۔ مذہب اور روحانیت، اخلاق اور معاشرت

تعلیم اور سیاسیات کوئی گوشہ ان کے دائرۂ التفات سے کب باہر رہنے پایا ہے۔ اس ساری داستان کے دہرانے کی ضرورت کس میں؟ اور اگر کوئی ہمت کر بھی جائے تو سننے والو کو اتنی فرصت کہاں؟ لیکن اکبر اپنا ایک مخصوص پیام بھی لے کر آئے تھے، ہر پھر کر الٹ پلٹ کر، منادی اسی کی کرتے رہے، کوئی سُنے یا نہ سُنے یا سنے اور سُن کر بھی نہ سمجھے، بہر حال اپنا پیام انھوں نے مُناسب کو دیا۔ اسی پیام کا نام اگر آئین اکبری رکھ دیا گیا تو کچھ بے جا ہوا؟

پیام کچھ دقیق و پیچیدہ نہیں۔ کوئی غامض فلسفہ نہیں، سیدھی سادی سی بات۔ صرف ایک لفظ میں ادا ہو سکتی ہے پیام "خودداری" کا ہے مشرقی سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ، ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی ہی بنا رہ، مسلمان کے لیے تلقین ہے کہ خبردار اسلام سے نہ ہٹ ـــــ اس ایک ترانہ کو خدا جانے کتنے دلکش نغموں میں کتنے دل آویز ٹھروں میں ہتیار بار دہرایا ہے۔ نوآموز مشرقی کو دانشگاہ فرنگ میں داخل ہوتے ہی پہلا سبق جو ملتا ہے وہ بے حیائی اور بے ناموسی کا ہے جس کا نام "استادوں" کی اصلاح میں ہے "حریت نسواں"۔ "صاحب" اور "میم صاحب" کے کھلے خزانے میل جول کو بے پردہ اختلاط کو دیکھ وہ کہنے لگتا ہے، کہ ہماری زندگی بھی اب تک کوئی زندگی رہی ہے گھریلو زندگی بھی کوئی زندگی ہے وہی صبح سے شام تک ماں باپ کی اطاعت، بڑوں کی رضا جوئی، بھائی بہنوں سے میل جول، نماز اور قرآن، مسجد اور گھر کی انگنائی! زندگی نام ہے آرٹ کا "فنون لطیفہ" کا "پکچر گیلری" کا "ڈرامہ" کا "سینما" کا "آپیرا ہاؤس" کا، ریڈیو کا، گانے کا، ناچنے کا، اپنی بیوی کو دوسروں کے پہلو میں بٹھانے کا، دوسروں کی بیویوں کے ساتھ خود رقص کرنے کا۔ اب پردہ اس کے نزدیک سب سے بڑی مقیدیت ہے اور سب سے پہلے اسی قید سے وہ اپنے اسیروں کو رہا کرتا ہے۔ ترانۂ دعوت کی تلاش

اکبر کے کسی کلیات میں نہ کیجئے انھیں تو آپ روزمرہ اخبارات کے صفحات میں، عدالتوں کی کارروائیوں میں اور خود اپنے گرد و پیش براہ راست و بلاواسطہ مشاہدہ فرمائیں۔ اکبر ایک اسی قسم کے منظر سے متعلق صرف ایک سوال کر کے رہ جاتے ہیں ؎

کیا گزری جو ایک پردہ کے عدو رو رو کے پولس سے کہتے تھے
بیوی بھی گئی، عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، زیور بھی گیا

اس بے نقابی اور بے حیائی کو عقل و فہم سے جس حد تک تعلق ہے، غیرت دحیا کے یہ جہان تک موافق ہے اکبر اس پر کوئی ناصحانہ خطبہ نہیں ارشاد فرماتے، کوئی فلسفیانہ مقالہ نہیں سناتے، ایک رباعی میں ایک چبھتا ہوا سا فقرہ خود انھیں بیویوں کی زبان سے کہہ جاتے ہیں۔ فقرہ کو حسن قبول دہ عطا ہوتا ہے کہ اس ۵۰۔۶۰ سال کے اندر ہشیار بار بار زبانوں پر آچکا ہے، مخلوط کو گرما چکا ہے۔ بوڑھے تو بوڑھے، بچوں میں بھی کم ایسے ہوں گے جو نہ سُن چکے ہوں ؎

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیبیاں اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سیلاب بے عصمتی کے مقابلہ میں ہمارے آپ کے بزرگوں، مذہب و اخلاق کے رہناؤں نے جو سب سے زیادہ مضبوط بند باندھا تھا وہ خود عورت کی شرافت کا تھا۔ اپنے ہاں کی شریف زادیوں کی، اپنی بہو بیٹیوں کی، حیا و غیرت کی ہم قسم کھایا کرتے تھے اور مگن تھے اس خیال میں کہ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے ان حیا کی پتلیوں کا آنچل بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟ اور اس محال کو ممکن اگر فرض کر لیا جائے تو ان کے بھائی اور باپ اور بیٹے اور شوہر انھیں زندہ کیوں چھوڑنے لگے؟ یہ ہمارے مردانہ خون کی گرمی ہے کس دن کے لیے، آنکھ اگر بے جا اٹھی تو آنکھ ہی نہ پھوڑ کر رکھ دی جائے گی؟ پیر اگر بے جا پڑا تو پیر ہی نہ کاٹ کر پھینک دیا جائے گا؟ ـــــ لیکن ”مہذبانہ“ تہذیب کا لشکر جب حملہ آور ہوا تو پہلی گولہ باری ہمارے انھیں قلعوں

اور بُرجوں پر ہولی اور آن کی آن میں "صاحب" کے اقبال سے ہمارے یہ سارے وُصس اور وہ مدے مسمار! اسکولوں اور کالجوں میں تو سبق ہی اس کا ملا، کہ اب تک جن نظاروں پر اپنا خون کھولاتے تھے ان پر فخر کرو، انھیں اپنے حق میں نعمت سمجھو نعمت۔ ناز کرو اپنی اس خوش بختی پر کہ بام ترقی کے زینہ پر قدم رکھنے کا شرف نصیب ہوگیا

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصّہ نہیں آتا

اس دربارِ دربار میں تو عزّت وتقرب کا معیار ہی یہ ہے کہ خود بھی ناچیے اور جو کل تک گھر کی ملکہ تھی اسے بھی چار دیواری سے باہر لا دوسروں کے ساتھ نچایئے ؎

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہوگیا
"سر" ہوگئے تو "بال" کا بھی شوق ہوگیا

یہ "سر" اور "بال" کی مناسبت کیا خوب!

زنانہ اسکول اور کالج اکبر کے زمانے میں اچھے خاصے کھل چکے تھے۔ اپنی قوم کی صاحبزادیوں کو "چراغ خانہ" سے "شمع محفل" بنتے اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے لیکن مادی دمالی ترقی کے آثار تو اب بھی کوئی نہ تھے، مذہب اور روحانیت کے تخیل کو الگ رکھئے کم از کم یہ تو ہوتا۔ کہ دنیا جنت بن گئی ہوتی عقبیٰ چلی تو چلی، دنیا ہی ہاتھ آجاتی مشاہدہ اس کے برعکس ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں ...

ترقی کی تمیں ہم پر چڑھاکیں گھٹا کی دولت اسپیچیں پڑھاکیں
رہیں ہر پھر کے آیا ہی نصیبن وہ گو اسکول میں برسوں پڑھاکیں

یہ نقش اول تھا کلیات حصّہ اول میں نقش ثانی کلیات حصہ سوم میں ملاحظہ ہو۔ مرقع وہی، آب و رنگ۔ پیشتر سے زاید ؎

اک شیخ نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا اک شیخ نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے بالؔ میں رقصاں

وہ تو ہاتھ سے یوں بے ہاتھ ہوئے اور غیروں میں جذب ہو کر رہ گئے۔

باقی جو بچے گھر اُن کا تھا افلاس کا مارا

بیراوہ بنا کلب میں یہ بن گیس آیا

مصرعہ کے الفاظ سُن چاہے خوب ہنس لیجئے معنی پر خیال کر کے عجب نہیں جو رونے پر طبیعت آمادہ ہو جائے گی۔

فی بی نہ رہیں جب تو میاں بن بھی سدھارا

انجام ؂

دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا

ایک مسلمہ نہیں ہندو خاتون کو نصیحت کر رہے ہیں (اور نصیحت کرتے وقت بھنتے نہیں) کہ کہیں سرے سے لکھنے پڑھنے ہی سے روک دینا تھوڑے ہی منظور ہے مقصود تو ذرگن بننے سے روکنا ہے گی۔

پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

اور یاد رکھو کہ۔

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

(بسلسلہ صفحہ ۱۰۳) ۱؎ یہاں "پیر" سے کھلا ہوا اشارہ سر سیدؔ کی جانب ہے۔

۲؎ یہاں "پیر" سے اشارہ ہے جسٹس سید کرامت حسین (الہ آباد) کی جانب انھوں نے الہ آباد سے آکر لکھنؤ میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا سرمایہ لگا کر مسلم گرلز اسکول قائم کیا تھا (جو بعد کو کالج بن گیا) حضرت اکبرؔ انھیں "پیر نسواں" کہا کرتے تھے شعر میں بھی لائے ہیں ؂

ترقی پر خدا کے فضل سے ہے بزم رنداں بھی فقط پیر مغاں تھے آگئے اب پیر نسواں بھی

۵؎ انگریزی ناچ جس میں مرد عورت ہم بغل ہو کر ناچتے ہیں۔

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب   آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

یہ کونسل اور اسمبلی اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی میں عورتوں کی ممبری کا "حق" تو اب حاصل ہوا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں "ترقی" کی رو یہاں تک کہاں پہنچنے پائی تھی لیکن نگاہ دوررس نے بہت سی آگے کی باتیں بھی دیکھ لی تھیں، پچیس تیس سال ادھر ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خودداری پر قائم رہنے والی نسل اب کہاں باقی ع

چل بسے وہ جنھیں مقدور تھا خودداری کا

اب تو دور دورہ ان کا ہے جو خود ہی بُری طرح مغرب زدہ ہیں ع

شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

ان کی ہنسی اور ان کی خوشی تک 'صاحب' کی ہنسی اور 'صاحب' کی خوشی کے تابع ع

رمضان ساعت کرکٹ ہے تھیٹر میں ہے عید

نئی تہذیب نئی راہ نیا رنگ جہاں   دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

نتیجہ یہ نکلا کہ،

زہرہ ممبر ہوئیں، ووٹر تھیں جناب خورشید

اس پر ؎

دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب   کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید

آپ کے مردوں ہی کے کون سے کارنامے ہیں کہ اب آپ عورتوں کو بھی اسٹیج پر لانے لگے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہو بزم میں کیا رعب و وقار   کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

اس دقیانوسیت کو اس زمانہ میں برداشت کون کرسکتا تھا ع

نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

لہ اکبر نے یہاں اُردو میں دخل انگریزی تلفظ رکھا ہے تھی۔ اے ٹر

اور تو اور یہ

لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریق تائید
دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ	ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ کہنا ہے نظم بھر کی جان ہے

خود تو لٹ پٹ کے لیے جان دیئے دیتے ہیں	ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

ڈراما کا آخری پردہ ہے

اکبر افسردہ شد از گرمیٔ این طرز سخن	شیخ بگریخت و در صومعۂ خویش خزید

آدم کے بیٹوں اور حوا کے بیٹیوں کی زبان پر ترانہ مسرت ہے

کھل گئے در نہ رہا شاہد مشرق کو حجاب	غل مچا ہُرّے کا بول اُٹھے یہ مغرب کے مرید
للہ الحمد بر آن چیز کہ خاطر می خواست	آخر آمد ز پس "پردہ" تقدیر پدید!

آج زندہ ہوتے تو اس وقت تک کے واقعات کو دیکھ دیکھ خدا جانے کیا کیا کہہ گئے ہوتے! اُس وقت بھی قطعات میں رباعیات میں، تو بہت کچھ ہی گئے ہیں۔ غزلیں تک اس پیامی شاعری سے خالی نہیں ایک پرانی غزل ہے بیبیاں کب تک تیلیاں کب تک، اس زمین میں بھی یہ گلفشانی موجود — ایک صدائے درد ہے کہ جین نہیں لینے دیتی کسی نہ کسی پہلو سے لب پر آہ بن کر آ ہی جاتی ہے

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بی بیاں کب تک	بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
جو منہ دکھائی کی ہے رسم پرشر ابلیس	تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک

انجام جو ہوتا ہے وہ آغاز ہی سے ظاہر ہے

سُنا ہے حضرت اکبر ہیں حامی پردہ	مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

غزل سنہ ۱۸۹۱ء کی ہے یہ سنہ ۱۹۳۷ء، ۴۶ سال قبل کا یہ کشف! اللہ اکبر!

خیال نہ گزرے کہ آئینِ اکبری کی یہی ایک دفعہ یا اہم ترین دفعہ، آزادئ نسواں کا بے پناہ طوفان ہے۔ اس آئین کا مرکزی نقطہ تو وہی خودداری ہے، اپنی شرافت کا تحفظ اپنے تمدن کا تحفظ، اپنی آن بان کا تحفظ، جس مورچہ سے بھی انھوں نے اپنے الہامی پادوں کے پرے جما دیے ہیں۔

پڑھ لکھ کر کون اپنے محلہ کے کھنڈروں میں پڑا رہا ہے؟ "ولایت دیدہ" اور "صاحب رسیدہ" ہونے کے بعد کس نے مسجد میں جاکر نماز باجماعت پڑھی ہے؟ یہ تعلیم اپنوں سے چھڑانے والی ہوتی ہے یا اپنوں کو اور زیادہ اپنانے والی؟ اکبر اس منظر کو دیکھتے ہیں مگر کن آنکھوں سے ؎

نہ مسجد میں نظر آئے نہ رہتے ہیں محلوں میں ترقی پا کے بس مل جاتے ہیں برگِ گُلوں میں!

اگلی سادگی اور اخلاص مندی اور برگزیدگی کی جگہ قدم قدم پر خود غرضی، ذاتی نمود، اور نفسی نفسی کا زور، اور زبان پر قومی ہمدردی کا نمائشی وظیفہ:

نہ وہ مسجد نہ جماعت نہ وہ طاعت نہ دعا نہ وہ گل ہیں نہ وہ گلشن نہ وہ سبزہ نہ ہوا
نہ قناعت نہ توکل نہ وہ خودداری ہے جاہ و ثروت کی تمنا میں گرفتاری ہے

سب سے پہلا پھندا مشرق کی گردن کے لیے یہ تیار ہوتا ہے کہ خط غلامی لکھنا پڑے تو بلا سے لیکن ایسی بابرکت سراپا رحمت، سرکار بھی دیکھنے میں آئی تھی؟ یہ ریل، تار، ڈاک، عدالتیں کونسلیں، یہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی ایجادیں پہلے کبھی خواب میں بھی نظر آئی تھیں؟ اس کا عکس اکبر کے جامِ جم میں ملاحظہ ہو ؎

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے
عطا ہوئی ہے نہ اسپیکروں کو آزادی کہ حاکموں میں ہر قال تو یال تول بھی ہے
محل مسل علی ڈاک و تار کی ہے روش اگرچہ دل میں نہاں عظمتِ رسول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی　　جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی　　کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہو رہا انجن　　کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر　　تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ذیم فول بھی ہے

یہی رنگ آگے چل کر اور زیادہ نکھر جاتا ہے اور کاغذ کے پھول خوش رنگ اور خوشنما تو پہلے ہی سے تھے لیجئے اب خوشبو بھی دینے لگے ؎

کیوں نہ اپنے دل کو ہو ان سے ملاپ　　لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ
ان کی بڑھتی سب مناتے ہیں یہاں　　خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ
ہر طرف سامان ہیں آرام کے　　کھل گئی ہے ہر طرف ہر شے کی شاپ
ہو گئے روشن حدودِ آسماں　　علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ
ساری دھرتی دب گئی سائنس سے　　لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ
حضرت واعظ ہیں راضی رقص پر　　دیر ہے کیا اب پڑے طبلہ پہ تھاپ

اپنی اصل اور اپنی نسل پر شرمانے والے بھائی بند آپ کی نظر سے بھی بارہا گزرے ہوں گے ۔ بس کی بات نہیں ورنہ یہ اپنے چہرہ کے رنگ کو چھیل کر پھینک دیتے اپنے ماں باپ کا نام بدل ڈالتے ، اپنی قومیت وطنیت سب دیسی سے ولایتی کر لیتے ۔ اکبر کی نگاہ سے کہاں بچ سکتے تھے ۔ اکبر کی نظر انسانیت کے ان مسخ شدہ نمونوں پر پڑتی ہے ان بچاروں کی مغرب زدگی پر وہ ترس نہیں کھاتے کچھ زیادہ غصّہ بھی نہیں کرتے مسکرا کر رہ جاتے ہیں اس تبسم کی جگمگاہٹ دیکھنے کے قابل ہے ؎

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے　　چارہ ہی مگر کیا تھا فطرت جو یہاں جن دے
جو جس کے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا　　یاروں کے لیے عہدے چڑیوں کے لیے پھندے

مسکراہٹ کی جلوہ نمائی ہو چکی ۔ اب ذرا ہنسی کی جھلکیاں ملاحظہ ہو ۔ معنی کی طرف

جایئے تو تمام تر مرثیت اور محفوظا ہر تک رہیے تو ظرافت ہی ظرافت۔ مدت کی بات ہے، امیر خسرو دہلوی کبھی کوئے محبوب میں گدائی کے لیے نکلے تھے اور ایک صدا لگاتے چلے گئے تھے۔ اکبر نے بھی وہی پُرانا خرقہ نکال کر جابجا پیوند لگا، پہن لیا، ہاتھ میں کشکول گدائی وہی، لب پر صدائے فقرانہ وہی، لیلائے تہذیب پر جان واری اور ایمان نثار کرنے چلے ہیں۔ اور الاپتے جاتے ہیں ؎

اے شوقِ وضعِ مغربی در ما فگندی ابتری ہر چند شفقت میکنم لیکن تو زاں بالا تری
شبنم شہید جلوہ با افتادہ در کمپ شما باشد کہ از بہر خدا سوئے شہیدان بنگری
سحر نگاہت نازمن مرکوز طبعت راز من ہر نغمہ ات بر ساز من حقا عجائب دلبری
تو سینہ گشتی دل شدم ٹچر شدی بیوپل شدم تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
ہر چند با تو بستہ ام از لعن اکبر خستہ ام للہ لطف خاص کن بیدا بحق نیچری

شرابِ طہور، کا مزہ کہتے ہیں کہ اسی دنیوی شراب کا سا ہوگا، یہی تیزی، یہی جوش و خروش۔ اثرات اس سے بالکل الگ نہ کسی قسم کا نشہ نہ زوالِ عقل نہ خمار نہ گرانی۔ اکبر کے صحخانہ میں اس شرابِ طہور کے جام پر جام جتنے چاہیے چڑھاتے چلے جایئے۔

خودی کی بقا خودداری کے تحفظ کے لیے جو کچھ کہنا ہے محض مسلمانوں ہی سے بطور سرگوشی نہیں کہتے۔ ہندوؤں مسلمانوں کے بھرے مجمع میں سب کو سنا کر کہتے ہیں اور بعض دفعہ تو رخ بالکل ہندوؤں ہی کی طرف پھیر کر کہتے ہیں ؎

ہوٹل سے بھلا پرہیز تھیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

اور کبھی ہندو بھائی ہندوؤں میں ایسا گھُل مل جاتے ہیں کہ ان کے غیر معلوم ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے اپنے ہی نظر آنے لگتے ہیں ؎

زبان سنسکرت اس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے
کہ اچھا ہے مری الفت تمھارے دل میں رہتی ہے
میں خوش ہوں گی بلا شک تم اگر مجھکو ملاؤگے
مگر وہسکی پلاؤگے کہ گنگا جل پلاؤگے؟

خوب جانتے ہیں کہ دربار فرنگ میں قدر نہ مسجد کی نہ مندر کی پرسش نہ ملّا کی نہ برہمن کی اس سرکار میں تو ایک ہی اعزاز ہے: خلعت غلامی! اور اس رجسٹر میں تو قومیت کا ایک ہی خانہ ہے: نیٹو یا کالا آدمی! وہ تمام ترعیش منائیں ہم آپ صرف ہل چلائیں۔ وہاں تمامتر خواجگی وحکومت یہاں سرتاسر شکستگی وعبودیت۔ ادھر افراط تنعم سے مدہوشی، ادھر نیم فاقہ کشی سے غشی، ان کی کوٹھیوں میں زر وجواہر کے خزینے، اپنی جھونپڑیوں میں افلاس ونقر کے پسینے! یہ منظر ہم آپ سب ہی ہر روز دیکھتے رہتے ہیں۔ اکبر کی زبان سے سنیئے تو یہی ٹریجیڈی کامیڈی بن جائے۔ اور حزنیہ گھڑی بھر کے لیے طربیہ میں تبدیل ہو جائے ؎

سمجھا رہے تھے مجھ کو کٹ کی وہ گرزشیں — خود کر رہے تھے ناک کی سٹی سے سازشیں
نشّے میں دیکھا تھا وہ پیتے تھے جام مے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ — الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دُم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی — میں نے کہا یہ بات میرے ذہن میں کبھی تھی
اللہ رے ارتقائے سگان درِ حضور — کل تو تھے "تم" ہوئے تھے ہوئے آج تم نے آپ
ہنس کر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق — گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

یہ کونسل، اسمبلی، الکشن، ووٹ کے رنگا رنگ و خوشنما کھلونے اس بڑی تعداد میں تو اب نکل پڑے ہیں۔ لیکن ان کی اچھی خاصی کھیپ اکبر کے زمانہ میں بھی ولایت سے آچکی تھی اور ہندوستان بہت سی بازیوں کے بعد اس نئی بازی کی بساط پر جھکا ہوا کھیل میں

غرق دنیا و آخرت دونوں کو بھول چکا تھا۔ اکبر ان کھلونوں سے دل لگاتے تو کیا، البتہ جی بہلایا ان سے خوب ہی۔ جو کچھ اپنی عینک سے دیکھتے دوسروں کو بھی دکھانا چاہتے۔ یہ اور بات ہے کہ دیکھتا کون؟ یہاں سرے سے دیدۂ بصارت ہی غائب ہو چکا تھا ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی
پانوں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

یہی راگ ایک دوسری دھن میں ؎

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر — جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر
شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے — آخر کیا شے یہ ممبری ہے
نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج — کونسل تو ہے ان کی ہی جن کا ہے راج
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں — اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل نہ دین ہے نہ دنیا — پنجرے میں پھدک رہی ہے مینا

یہی تصویر ایک اور رخ سے ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے — خدا کی مار ہے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

باتیں کہتے تو سب ہی کے کام کی، لیکن قدرتاً اپنی جماعت اور قوم (مسلمانوں) کا غم اور زیادہ کھائے جاتا۔ اپنی آنکھوں سے ہر وقت دیکھتے کہ کیا سے کیا ہوئے جاتے ہیں قدم بجائے کدھر کے کدھر پڑتے جا رہے ہیں دل روتا۔ چہرہ ہنستا ہوا بنائے غم کی گھٹن کوشش تھی کہ قہقہوں کی گونج میں دب کر رہ جائے۔ لکچروں میں ترقی کا شور

سُن خود بھی اپنے ہم قوموں کو ترقی کے طریقوں پر ایک طویل لکچر دینا شروع کر دیتے ہیں ؎

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ ۔۔۔ خالق کا شکر کیجئے آرام کیجئے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم ۔۔۔ تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجئے
یورپ میں پھریئے پیرس و لندن کو دیکھئے ۔۔۔ تحقیق ملک کا شغر و شام کیجئے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن ۔۔۔ خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجئے
الفاظ کفر و فسق کو بس بھول جائیے ۔۔۔ ہر ملت و طریق کا اکرام کیجئے
رہتے جہاں ہیں وسعت مشرب سے نیک نام ۔۔۔ مجھ کو مرید ہندوؤں کو رام کیجئے
رکھئے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر ۔۔۔ دولت کو صرف کیجئے اور نام کیجئے
سامان جمع کیجئے کوٹھی بنایئے ۔۔۔ باصد خلوص دعوت حکام کیجئے
یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے ۔۔۔ تکمیل شوق پستہ و بادام کیجئے
نظارۂ بتان سے تر و تازہ رکھئے آنکھ ۔۔۔ تفریح پارک میں سحر و شام کیجئے
زنجیر نقہ توڑ یئے کہکر خلاف شرع ۔۔۔ مضمون لکھئے دعویٔ الہام کیجئے

اور شعر یہ کہا ہے ؎

مذہب کا نام لیجئے عامل نہ ہو جیے ۔۔۔ جو متفق نہ ہو اسے بدنام کیجئے

اس کے بعد قدرتاً بس یہی کہنا رہ جاتا ہے ؎

لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے ۔۔۔ مُردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجئے

درد آشنا دلوں سے پوچھئے کہ اس تصویر میں کچھ بھی مبالغہ ہے؟ اس شاعری میں کہیں سے بھی "شاعری" ہے؟ آج ہمارے علم، ہمارے ادب، ہماری زبان، ہمارے مذہب، ہماری شرافت، ہماری تاریخ، کسی کی کچھ بھی وقعت ہے، عزت ہے، اہمیت ہے، جب تک کہ "صاحب" کا صداقت نامہ بھی ساتھ ساتھ نہ ہو؟ بس ایک "صاحب" کی بات بالا، اور اس کے علاوہ سب کچھ ہیچ۔ اکبر ابنی اس ہیچیری کو

خوب ہی محسوس کرتے ہیں ؎

دورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں تفرقہ دیکھئے ذرا ہم پہ پڑے عجیب دن
جان سپردِ ڈاکٹر، مال سپردِ آں جناب عقل سپردِ ماسٹر، روح سپردِ ڈارون

زندگی کا کوئی ایک شعبہ ہو، تو کہا جائے یہاں تو ساری کی ساری زندگی اسی غلامانہ ذہنیت یا جدید علمی اصطلاح میں اسی INFERIORITY COMPLEX کی نذر، فرنگستان کی ہاٹ ماکینی معزز! اپنے ملک کا بڑا اسا بڑا اوچی بھی محض موچی! ہوٹل لٹھا ہوا بھی اس کا کارندہ بہر حال منیجر! خسرا ٹری سے بڑی بھی ہو، اس کا مالک بیچارہ محض بھٹیارا! گلی ڈنڈے کا نام آئے تو آپ شرما جائیں، کرکٹ اور ہاکی ٹیم کی کپتانی کا عہدہ پیش ہو تو چہرے فخر و مسرت سے جگمگا اٹھیں. فقیہ ہونا گویا ملائیت کے مترادف، ایڈوکیٹ اور بیرسٹر ہونا اعزاز و مرتبہ کا پروانہ. بغرض اپنی اعلیٰ و ادنیٰ بڑی اور چھوٹی ہر چیز اسی ذہنی مرعوبیت کا شکار، اسی ذہنی غلامی کی پیداوار! حضرت اکبر خودداری کے اس قحبا کو، اغیار کے اس ہمہ گیر تسلط کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں، لیکن کمالِ ضبط یہ ہے کہ دل کی دکھن کو بھی ظرافت کی پھلجھڑی بنا کر پیش کرتے ہیں ؎

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اور پھر ردیف و قافیہ اور وزن بدل کر ؎

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

(صاحب) کی زبان سے طعنے بارہا سن چکے تھے، کہ ہندی طلبہ سب کچھ لکھ پڑھ چکنے کے بعد بھی وہ کلچر، وہ آراستگی خیال اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں، جو فرنگی زادوں میں گھر گھر موجود ہے۔ اس طنز کے محققانہ اور سنجیدہ جوابات تو بارہا ہو چکے ہیں اس وقت ایک لطیف جواب اکبر کی زبان سے سنئے یہ طرز جواب حصہ ہے اکبر کا ؎

کر چکا کالج میں جب تکمیلِ فن ۔۔۔ تب یہ بولے مجھ سے مسٹر مارلین
گو کہ شہرت ہو تمھاری دور دور ۔۔۔ مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور

اُستاد کے طعن کے جواب میں شاگرد عرض کرتا ہے کہ قصور معاف، یہ خطا کس کی ہے شاگرد کی یا اُستاد کی؟

آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے ۔۔۔ اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

مغربی اُستادوں کی زبان سے چند الفاظ ہم نے سیکھ لیے ہیں، کچھ بے معنی سے زبانوں پر بھی رٹا ہوا آموختہ رہتا ہے اور دل انھیں مقامہ لایعنی کی دُھن میں سرگرم، تعلیم، اعلیٰ تعلیم جبری تعلیم، ترقی، روشن خیالی، ارتقا وغیرہ چند منتر ہیں جن کے مسحور کن اثر سے کون واقف نہیں؟ اکبر نے ان میں دو لفظ "چندہ" اور "اسکول" انتخاب کر لئے اور انھیں ایک مخمس کی ٹیپ بنا۔ اُن سے خوب خوب کام لیے ہیں ؎

بکری کو ساگ پات کا سودا نہیں رہا ۔۔۔ بنگالیوں کو بھات کا سودا نہیں رہا
چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہیں رہا ۔۔۔ اور شاطروں کو مات کا سودا نہیں رہا
الجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

بنیوں کو اخذ سود کی فرصت نہیں رہی ۔۔۔ منعم کو داد دجود کی فرصت نہیں رہی
لڑکوں کو کھیل کود کی فرصت نہیں رہی ۔۔۔ کودن کو غنت رپود کی فرصت نہیں رہی
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

اسی طرح برابر ٹیپ پر ٹیپ جماتے چلے گئے ہیں اور خاتمہ پر فرماتے ہیں ؎

پنڈت پرا جاکے بنارس پہ آرہے ۔۔۔ مرکٹ کے شیخ شہر بھی نویس پہ آرہے
حالی غزل کو چھوڑ مسدس پہ آرہے ۔۔۔ ہم فرد تھے سو ہم بھی مخمس پہ آرہے

ادراک اگر صحیح رہتا تو پھر بھی اُمید اصلاح تھی لیکن جب سرے سے ادراک ہی غلط ہو جائے سفید، سیاہ اور سیاہ سفید نظر آنے لگے اور تعلیم۔ قلب کی قلب ماہیت

کردے اور اکبر ہی کی پیشگوئی،

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

واقعہ بن کر رہے، تو پھر علاج کس کے بس میں رہ جاتا ہے! اکبر کو حیرت بار بار اسی الٹی سمجھ پر ہوتی ہے اور دعوت وہ اسی کی دیتے ہیں کہ صحیح غور و فکر کرنا سیکھو، اور اندھیرے میں وہم کو حقیقت کا درجہ نہ دے بیٹھو۔ یہ سارا دلفریب منظر ترقی محض سراب ہے یا حقیقتاً جوئے آب؟

تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر — دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو، خلقت سے مل کے دیکھو — کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

شاعر، ظریف شاعر سہی بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔ دل میں ناسور پڑ چکے ہوں تو بُشرہ کو ہنستا مسکراتا ہوا کب تک رکھا جاسکتا ہے۔ دل کی کسک آخر اپنے پورے زور کے ساتھ زبان پر آکر رہے گی۔ خودداریوں کا خون روزانہ اپنے گرد وپیش ہوتے ہوئے دیکھ کر شاعر کا دل خون ہو چکا ہے، اپنے عشرت کدہ کے کھنڈروں پر آکر رُکتا ہے اور در و دیوار کی گرتی ہوئی ایک ایک اینٹ حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے دل بھر آتا ہے لب پر آہ سرد ہے اور زبان پر دھیمے سُروں میں یہ مرثیہ ہے ؎

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا — وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائیگا جوبن پیدا
وہ تو پیدا نہ ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر — ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

اب اس مرثیہ کے سلسلے میں پھر کہتے ہیں ؎

پستیٔ قوم کے جب آگئے دن اے اکبر — اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا
باپ کے خون سے ہوگی جو حمیت زائل — ہوں گے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا

صورت برگ خزاں دیدہ بھریں گے اڑتے — نہ بہار آئیگی پھر ہوگا نہ گلشن پیدا
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ — کون کہتا ہے نہ کر حسرت لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملّت کے معانی کو نہ بھول — راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا
قوم قوم آٹھ پہر سنتے ہیں ہم قوم کہاں — تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی — یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا
سلف رسیکٹ کا پھر یاد رہے گا نہ سبق — پھر نہیں ہونے کی یہ بحث تو دشمن پیدا
بزم تہذیب سے ہو جائیں گے قطعًا خارج — حس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہو شیون پیدا

آئینِ اکبری کا آغاز آپ دیکھ چکے اب انجام ملاحظہ ہو۔ بچپن کی شوخیاں بڑھاپے کی جھریوں سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟ شادیانوں کی دھوم مچ چکی اب نوحہ کے بول بھی کان میں پڑ جائیں۔ آج ۱۹۳۶ء میں ہم کو اور آپ کو جو کچھ بچشم شہود نظر آ رہا ہے شاعرِ اُمت حکیمِ ملّت کی نگاہ کشفی نے اسے ۳۰، ۳۵ سال قبل ہی متانت کے ساتھ پڑھ لیا تھا۔ آنکھیں نم ہوئی جاتی ہیں دل کچھ بیٹھا سا جاتا ہے۔ اور جو کچھ خود دیکھ رہے تھے دوسروں کو دکھاتے جا رہے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردہ کی یہ پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبایع دورِ گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
عقاید پر قیامت آئیگی ترمیمِ ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی — لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

انقلاب دہر اپنے وقت پر بہرحال آیا وہ دن آگیا کہ غم کھانے والا اکبر نہ رہا اور وہ دن آ رہا ہے کہ خود اس نئے آئین اکبری کو سنانے والا بھی نئے سے پرانا ہو کر مٹ مٹا کر نسیاً منسیاً ہو چکا ہوگا۔

(۵)

موت میں زندگی[1]

"موت ایک دفعہ آئی اور جان ایک روز جانی ہے لیکن خوش نصیب ہے وہ عورت جو شوہر کی آنکھوں کے سامنے زندگی کو رخصت اور دنیا کو وداع کرے۔ میرا اصرار ماں کی محبت اور میری شفقت کا اظہار تھا ورنہ میں جانتا ہوں مجھے علم ہے، میرا عقیدہ ہے کہ سسرال کے پتھر میکے کے پھولوں سے، شوہر کی نفرت باپ کے پیار سے اور اپنے گھر کے چنے ان کے گھر کے قورمہ سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہیں۔" (نوحہ زندگی ص) خط باپ کا ہے، بیاہی ہوئی بیٹی کے نام۔ شوہر صاحب دوسرا نکاح کر چکے ہیں، اور یہ بیٹی دل و دماغ کے سخت عذاب اور جسم کے شدید آزار میں مبتلا ہے، باپ کو بیٹی کی قسمت پھوٹ جانے کی اطلاع پہونچتی ہے اور لخت جگر کے ساتھ اپنے دل کے ٹکڑوں کو خط کے خوان میں یوں لگا کر پیش کرتا ہے:۔

"ہم تو آج کیا اس دن سے تم کو رو چکے جب تم ہمارے گھر سے رخصت ہو کر سسرال پہونچیں۔ تقدیر اچھی ہوتی خوش رہتیں۔ آباد رہتیں، مقدر درست

---

[1] تحریر ۱۹۳۶ء۔ نظر ثانی ۱۹۵۳ء

نہ تھا پھولوں بھری سیج کانٹوں سے اور موتی بھرا تھال کنکروں سے پٹ گیا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ سوچنا یہ کہ اب کیا کرنی ہے۔ زندگی بھلی یا بُری جیسی گزرتی تھی گزر گئی۔ اب موت ایک اور زندگی شروع کرے گی ضرورت ہے کہ وہ زندگی خوشگوار ہو اور وہ شوہر جس کی دلہن بننے والی ہو اور جس کی سیج جنگل بیابان کی قبر ہو گی تم سے خوش رہے سسرال کے لوگ فرشتے اور حوریں تمھاری ہستی سر آنکھوں پر رکھیں اور تم آئندہ نسلوں کے واسطے ایسا سبق چھوڑ جاؤ کہ دنیا تمھارے نام پر فخر کرے اور بیویاں تمھارے قدموں کی خاک کا سُرمہ بنائیں...... آزمائش کا موقعہ اور امتحان کا وقت یہی ہے سینہ پر آرے کلیجہ پر چھریاں اور زخموں پر تیر چلیں مگر زہر کا ہر گھونٹ شہد اور تلخی کا ہر قطرہ شربت ہو۔" (صفحہ ۴۰ - ۴۱)

لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ اردو افسانوں میں بجز بے حیائی کے رکیک جذبات کے اور رکھا کیا ہے لیکن کہنے والے دیکھیں کہ کلیہ میں استثناء بھی کس پایہ کا ہے۔ جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ اردو میں افسانہ اگر اسی کا نام ہے تو کاش ہمارا سارا سرمایۂ ادب افسانہ ہی ہوتا!

خط ابھی ختم نہیں ہوا ہے آخری سطریں بھی پڑھ لیجئے:-

"بیٹی یاد رکھنا! عورت کی مصیبت اس کی شرافت کی کسوٹی ہے کوشش کرنا کہ باپ دادا کی آبرو میں فرق نہ آنے پائے اس دنیا کو خیرباد کہو اور اب ادھر کی لو لگاؤ جہاں ہمیشہ رہنا اور سدا رہنا ہے۔ ساجدہ! منزل کڑی اور راستہ ٹیڑھا ہے خدا کا نام لو، بسم اللہ کرو اور اب اس منزل میں قدم رکھو۔" (صفحہ ۱۱۱)

بحث یہاں افسانہ کی زبان سے، پلاٹ سے، کردار نگاری سے، اس کے کسی فنی پہلو سے نہیں۔ ان سارے پہلوؤں کو چھوڑئے۔ سوال یہاں صرف اس قدر ہے کہ اگر آپ صاحب اولاد ہیں اور اتفاق سے کسی لڑکی کے باپ بھی تو خود

بتائیے کہ دل پر کیا گزر رہی ہے؟ "زندگی" میں "موت" کا سماں کس نے اس طرح دکھایا ہے؟ افسانہ اور رومان کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر کس نے آخرت سے اس اس طرح ڈرایا ہے؟ شادی ایک مسلمان گھرانے میں ایک لڑکی کی ہو رہی ہے والدین ماشاءاللہ عبادتوں کے لحاظ سے اچھے خاصے دیندار لیکن رسم و رواج کی زنجیروں میں گرفتار، سانچق کے دن سگی بیوہ پھوپھی شامت کی ماری وہاں آنکلیں جہاں سات سہاگنیں دلھن کو جڑھاوا چڑھا رہی تھیں عین شگون کے وقت ایسی بدشگونی! بیوہ ہو کر سہاگنوں میں آملی اور پہونچی وہاں جہاں رسم و رواج کی شریعت، اس کے سایہ کے بھی پہونچنے کی روادار نہ تھی بس کچھ نہ پوچھئے کیا غضب برپا ہو کر رہا بھرے مجمع میں برادری کے نکھٹے میں بھاوج اور بھائی اور تنہا یہی دونوں کیوں یہ کہئے کہ ساری محفل اس گنہگار پر بپھر پڑی۔

"منجھلی آپا، غضب خدا کا یہ کیا ستم ڈھایا ایسی بھائی اور بھاوج سے دشمنی اور بھتیجی سے عداوت تھی، تو زہر دیدیا ہوتا، ہٹو یہاں سے خبردار جو زیور کو ہاتھ لگایا یا کپڑوں کو چھوا۔ جہاں آرا کو اس وقت اپنی بیوگی کا احساس ہوا جس قدر مہمان جمع تھے ان میں ایک ایسا نہ تھا کہ اس کی بے گناہی کو تسلیم کر لیتا۔ ہر عورت فردِ فردہ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور کہتی تھی کہ ایسی ڈاین بھی نہ دیکھی اور نہ سُنی، گن بہن آج تک دیکھی نہ سُنی، اول تو عین شگون کے وقت اپنا چہرہ دکھایا۔ اس پر یہ ستم کہ سہاگنوں میں آملیں دونوں پر طرہ یہ کہ دیکھ بھال کر اور سمجھ بوجھ کر زیور کو ہاتھ لگایا کہ توبہ توبہ لڑکی رانڈ ہو جائے ....

یہ وہ وقت تھا کہ آدھی رات کو ایک بیوہ عورت حقیقی بھتیجی کی شادی میں ایسی سنگین خطاؤں کی ملزم تھی تمام مہمان اور بھائی بھاوج اس کے خلاف تھے اور چاروں طرف سے بوچھار اور لعن طعن پڑ رہی تھی۔ جہاں آرا کی زبان خاموش تھی مگر اس کی آنکھیں اپنی بیگناہی کا عذر کر رہی تھیں وہ ایک ایک کی طرف دیکھتی تھی مگر کوئی اتنا نہ تھا کہ اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہہ دیتا یہاں تک کہ اسکا ہاتھ پکڑ کر دالان کے باہر نکال دیا گیا" (ص ۱۵)

اسی شب میں یہ رواج کی بندی ریت رسموں کی پوجا کرنے والی فیروزہ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ مرحوم ساس آئی ہیں اور اپنی قسمت کی ہیٹی بیوہ بیٹی کو سینہ سے لگا ہوئے کہتی ہیں: ۔

"بیوہ کی آہ میں، اس آہ کی آگ میں، اس آگ کے دھوئیں میں جو دونوں، میاں بیوی نے ہنس ہنس کر اور کھیل کھیل کر سلگائی اور بھڑکائی، خدا کا غضب اور قہر پوشیدہ ہے ہوا اس دھوئیں کو برباد نہیں کر رہی ہے فرشتے اس کو گود میں اور حوریں اس کو سینہ سے لگا رہی ہیں۔ زبان نے الفاظ کو چھری بنا کر رانڈ بہن کا دل زخمی کیا زخم کی اذیت، آہ میں تبدیل ہوئی آہ کا دھواں اس مالک کے حضور میں حاضر ہوا جو ظالم اور مظلوم دونوں کا مالک ہے یہ دھواں پہونچکر فنا ہونے اور مٹ جانے والا نہیں ایک دوسری صورت اختیار کرے گا اور خدا کا قہر بن کر اس طرح نازل ہو گا کہ کلیجہ مسوس کر رہ جائے گی، فیروزہ! بیوہ کی آہ بھڑک چکی اب اپنی آگ ٹھنڈی کر اور یقین کر کہ یہ دھواں خالی جانے والا نہیں رنگ لانے والا اور مصیبت ڈھانے والا ہے" (صفحہ ۱۹)

یہ آپ افسانہ پڑھ رہے ہیں کہ کسی شیخ کامل کے حلقہ میں بیٹھے خشیت الٰہی کا درس لے رہے ہیں؟ اور خداشناسی نہ سہی، خودشناسی کی منزلیں تو بہرحال طے کرتے ہی جاتے ہیں۔ شعروشاعری کو اسلام نے سخت ناپسند کیا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ اور اَلشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ وغیرہ نصوص قرآنی کی تصریحات موجود ہیں لیکن قرآن ہی میں آخر یہ استثنا بھی تو موجود ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا مِّنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ اور خود رسول اللہ صلعم نے اسلام کے ہجوگویوں کے جواب میں حسانؓ سے نظمیں کہلائی ہیں اس سے معلوم یہ ہوا کہ شاعری بھی بعض حالات میں جائز ہونا کیسا، عین عبادت بن جاتی ہے اور جب یہ اصل مسلم ہو چکی تو کون کہہ سکتا ہے کہ ارزؔ میں راشدالخیری کی افسانہ نویسی اپنی جگہ پر ایک عبادت و موعظت نہیں؟

ہاں تو وہ قصہ رہا جاتا ہے ۔ بوہ گی آہ کا دعواں بالا بالا نہ گیا ۔ سیدھا عالم بالا کو پہونچا ۔ مرزا قدیر کا جوان بالا پوسا لڑکا ظہیر بیمار پڑا ، اور ایسا کہ چار پائی سے لگ گیا ۔ ماماتا کے مارے ہوئے ماں باپ نے دوا ئیں ۔ تدبیریں آخر سب ہی کر ڈالیں لیکن نہ ٹلنے والا وقت آکر رہا ۔

" سکرات شروع اور اس کے ساتھ ہی ماں باپ کھڑے اور پڑے پیٹنے لگے ۔ ظہیر سامنے لیٹا دم توڑ رہا تھا اور قدیر الگ کھڑا سر پھوڑ رہا تھا ، کبھی اندر جاتا کبھی باہر آتا ۔ آدھی رات کے وقت اپنے کمرہ میں آ خاموش بیٹھ گیا ۔ آنکھیں کچھ بند تھیں کچھ کھلی ، خدا معلوم عالم خواب تھا یا بیداری اور واقعہ تھا یا تخیل ایسا معلوم ہوا کہ جہاں آرا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ہے اور ان کی انگلیاں پکڑے سامنے کھڑی ہے " ۔ "

یہ وہی چند سال پیشتر والا منظر ہے ۔ سگی بیوہ بہن اپنے دو یتیم بچوں سمیت ، محض ایک جاہلانہ دستور کانہ رسم کے توڑنے کے جرم میں ذلت و خواری کے ساتھ دھکے دے کر نکالی جا رہی ہے اور پیٹتے چلتے کہتی جا رہی ہے ۔

" بھیا کوئی گھر ہمیشہ شادی کا نہیں رہتا جہاں آج شادی کے جلسے ہیں ، وہاں کل موت کا بین ہے جہاں ابھی خوشی کے نقارے ہیں وہاں تھوڑی دیر کے بعد ماتم کے تاشے ، جس دالان میں سمدھنیں اور براتی ہیں اس میں تعزیت اور عیادت والے بھی شریک ہونے والے ہیں ۔ سوں ! یہ گھر حسرت کی شادی سے بھرا پُرا نہ رہے گا ۔ یہاں ظہیر کا ماتم بھی ہوگا آج میری اور میرے بچوں کی موت سے تیری تیوری پر بل نہ آئے اور تینوں موتیں تو ہنس کر ٹال دے ، مگر اس دروازہ سے ان تین کے بعد ایک ایسی لاش نکلے گی جو تیرے ہوش و حواس باختہ کر دے گی ! "

عالم غیب کی یہ پیشینگوئی عالم شہادت میں حرف بحرف پوری ہو کر رہی اور جہاں تک اس قصہ کا تعلق ہے ، نوبۂ زندگی کا تعلق ہے ۔ نوحۂ زندگی کا خاتمہ نوحۂ موت پر ہو کر رہا

آخرت کی فتح دنیا پر" کل" کی فتح " آج " پر، روحانیت کی فتح مادیت پر!

خیال نہ گزرے کہ کتاب کا موضوع ہی غم کی مصوری ہے "نوحۂ زندگی" نام ہی نوحہ وشیون کا ہے، اس لیے اگر اس میں موت کا ذکر بار بار آگیا اور آخرت کے خوف سے سطر سطر میں ڈرایا گیا۔ تو بات کچھ ایسی داد و فخر کی نہیں، مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے زندگی کے جس شعبہ کو بھی ہاتھ لگایا ہے اسے شاد مکافات عمل کے رنگ سے رنگ دیا۔ نسوانی زندگی کی ایک کامل سرگزشت اور مکمل روئداد چار جلدوں میں "صبح زندگی" "شام زندگی" اور "شب زندگی" (دو حصے) کے نام سے لکھ ڈالی ہیں۔ اس میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے سارے دور، عورت کی زندگی کے آگئے ہیں۔ خصوصاً صبح زندگی کے تو ہر ہر صفحہ سے زندگی ہی کی کرنیں طلوع ہو رہی ہیں اور بڑے سے لے کر چھوٹا شاید ہی کوئی مرحلہ نسوانی زندگی کا چھوٹنے پایا ہو، کہیں بچی کو لیے گود میں کھلا رہے ہیں اور کہیں انگلی پکڑے اسے ٹہلا رہے ہیں۔ کہیں برسات میں جھولا جھلا رہے ہیں کہیں اس کی توتلی زبان میں اس سے کہانی کہہ رہے ہیں، مکتب میں اسے حساب کے پہاڑے یاد کرا رہے ہیں اور ابھی جانماز پر بیٹھے اسے مناجات بر زبان یاد کرا رہے ہیں کہیں انگنائی اور دلان میں جھاڑو دلا رہے ہیں اور کہیں باورچی خانہ میں سالن بگھارنے اور حلوہ پکانے کی ترکیبیں بتا رہے ہیں۔ ابھی بنیوں سے مول تول، بازار کے سودا سلف کی گفتگو ہو رہی تھی، ابھی انگشتی پیچک لیے ہوئے سلائی، کترائی، کٹائی بخیہ کے بقیہ کھولے بیٹھے ہیں۔ غرض ہر طرف زندگی ہی زندگی کی بہار ہے لیکن بہار کی اس گرماگرمی میں بھی زندگی کی خزاں کی یاد، دیدۂ دل کے سامنے سے ہٹنے اور نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پائی۔

"تکاثر" ایک خوش حال خاتون ہے، دنیا پرستی ہوئی، آخرت کو بھولی ہوئی

بدمزاجی کے باعث محلہ بھر ساتھ چھوڑ چکا ہے ۔ یتیم خانہ کی لڑکی معصومن قبضہ میں ہے، سارا غصہ اسی کی جان ناتواں پر ٹوٹتا ہے ۔ دوپہر کے وقت ایک روز لڑکی کو بخار چڑھا جاڑوں کے دن تھے دھوپ میں بیٹھی کپ کپا رہی تھی تکاثر نے پٹاری منگوائی زبردست کے بسوے ہیں اٹھی اور لائی چھ سات برس کی جان ۔ بخار میں جھلسی ۔ بچا پانسیر تانبا ہاتھ میں، پاؤں پھسلا اور دھڑام سے گری بیمار کا گرنا تھا تکاثر جھلا کر اٹھی پٹاری کو تو نہ ہیں چھوڑا اور معصومن کا ہاتھ پکڑ کر بیدردی سے گھسیٹتی ہوئی لائی بخار زدہ معصومن کی حسرت آمیز نظریں تکاثر جلاد سے رحم کی ملتجی تھیں اور بیگناہی کا اظہار کر رہی تھیں ۔ مار پڑنی شروع ہوئی جب طاقت ضبط نہ رہی تو رو رو کر کہنے لگی بیگم صاحب اب معاف کر دیجئے پھر کبھی نہیں گراؤں گی بے بس لڑکی کی منت و زاری کا تکاثر پر کیا اثر ہوتا مارا جتنا مار سکتی تھی مار چکی تو ایسا دھکا دیا کہ اوندھے منہ جا کر تخت پر گری ۔ کنپٹی میں کیل جیسی خون کی مکی بندھی سارا چہرہ لہولہان ہو گیا " (صبح زندگی ص۱۴۹)

مظلوم کی آہ کی رسائی کے لیے عرش الٰہی تک کے راستے بے روک ٹوک کھلے ہوئے ہیں مبتدا کی خبر جلد ہی نکل آئی :۔

" قبولیت کی گھڑی عام آدمیوں کے واسطے کوئی خاص ہو تو ہو مظلوم کے واسطے تو حاکم حقیقی کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے معصومن کی التجا دکھتے ہوئے دل کی آہ تھی کلیجہ سے نکلی زبان پر آئی ، زبان سے نکلنے کی دیر تھی آسمان اور زمین دونوں کانپ گئے ، حاکموں کا حاکم بادشاہوں کا بادشاہ مظلوموں کا دادی ، معصومن ذارث جس کے حضور میں اتنی دیر گڑگڑائی اس فریاد کو سن رہا تھا "

(صبح زندگی ص۱۵۱)

تکاثر اسی شام کوڑی کا گردن میں پھوڑا نکلا آدھی رات تک تو کچھ سوئی اور کچھ جاگی مگر آدھی رات کے بعد تو پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی منہ اور گردن دونوں

سوچ کر کُبڑا ہو گئے بڑی مشکلوں اور مصیبتوں سے چیخ پیٹ رات کاٹی نماز دم خالہ نانی کو بلوایا چچی پھوپھی کو ڈولی بھیجی غرض جس نے دیکھا دم بخود رہ گیا، ڈاکٹر، جراح حکیم، طبیب سب ہی آ گئے اور گئے مگر تسکین کی صورت نہ نکلی۔ ایک چیخ آسمان اور ایک زمین پر تھی۔ جس شخص نے پیسہ تو پیسہ سوکھی روٹی تک کسی کو نہ دی ہو بھر بھر تھیلیاں روپے دے رہی تھی دنیا بھر کے جتن کروا لے مگر آرام و افاقہ کیا بیس سے انیس بھی نہ ہوا کس قیامت کی کھولن اور کس غضب کی جلن تھی کہ کسی کروٹ بھی چین نہ پڑتا تھا مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دوسری رات پہلے سے بھی بدتر گزری ایک زخم تھا جس پر کوئی کچوکے دے رہا تھا صبح جراح نے آ کر چیر دیا، دوپہر کو بخار چڑھا غفلت شروع ہوئی گھڑی دو گھڑی بعد ہوش آ جاتا تھا تو ایسی بلبلاتی تھی کہ سننے والوں تک کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، شام کو بخار ذرا ہلکا ہوا مگر پھوڑے کی تکلیف بدستور تھی۔ پلنگ باہر بچھوایا انگنائی میں آ کر لیٹی۔ یہ عمر بھر میں پہلا ہی دن ہوگا کہ تنکا تنکا ارحم الراحمین کے رحم کی ملتجی تھی اور اس کو یاد کر رہی تھی۔ عشاء کا وقت تھا کہ ایک فقیر نے دروازہ پر صدا لگائی۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

بیماری کی حالت، رات کا وقت، مضمون درد انگیز، فقیر خوش الحان، دفعتہً تمیز کو عاقبت کا خیال بندھا سوچنے لگی کہ بس زندگی کے دن پورے ہو گئے اور ایک آدھ روز یا دو چار گھڑی دنیا کی ہوا کھا رہی ہوں۔ لے لیا جو لینا تھا اور کر چکی جو کرنا تھا (صفحہ ۱۵۱)

اتنے میں ایک آواز کان میں آئی جو کہہ رہی تھی۔

- مجھ سے زیادہ ناعاقبت اندیش کون ہوگا۔ مسافر بن کر گئی، گھر والی بن کر بیٹھی پردیس کو وطن سمجھا۔ سرائے میں ڈیرے ڈالے اور اس بات کا کبھی خیال نہ آیا

کہ جو کچھ کر رہی ہوں حرف بحرف لکھا جا رہا ہے اور یہ دفتر ایک دن کھلنا ہے۔ کیوں تکاثر کال کے دن مٹھی بھر دانوں کے لالے اور تیرے ہی جیسے مظلوم و معصوم بندے دور دور سے آس لگا کر تیرے پاس آئیں اور تو منہ پھیرلے! دکھیاریاں مصیبت کی ماریاں بھوکی پیاسی تیرے در پر آکر پڑیں اور تو ان کا زیور تاکے تیس تیس چالیس چالیس روپے کی رقمیں محنت کی بنائی مصیبت کی جوڑی دس دس پندرہ پندرہ روپے میں ہتھیائیں اور تجھے کبھی رحم نہ آیا۔ یتیموں کے مال مارے۔ وقت پڑے دن کے زیور چھینے رانڈوں کے دل توڑے بچوں پر ظلم کئے۔ کسی کا مکان دبایا۔ کسی کی دکان اڑائی مگر او بیوقوف وہ سب وہیں تک کا تھا۔ اور وہیں کا وہیں رہا۔ آج تیرے ساتھ ان میں سے تو کچھ نہیں مگر ہاں مظلوموں کی آہیں اور دکھے ہوئے دلوں کی بد دعائیں تیرے ساتھ ضرور ہیں تکاثر! وہ ظلم و ستم اور غرور و تمکنت سانس ہی تک تھا۔ اب ختم ہوا۔ اب تو ہے اور ان کرتوتوں کا پھل جو کیا وہ بھر جو بویا وہ کاٹ۔ یاد ہے یا بھول گئی آدھی رات کا وقت، پانی کا طوفان اور روزہ بن ماں باپ کی بچیاں رات کی رات تیرے گھر پر رہنا چاہیں۔ منتیں کریں خوشامدیں کریں اور تو اس کان سنے اور اس کان اڑا دے ان کا کچھ نہ گیا تو نے آخرت برباد کی، نہ وہ دن رات کچھ بھی نہ رہا۔ مگر تیرا عمل باقی رہ گیا جس مکان پر اتنا گھمنڈ کیا۔ نہ وہ سدا رہنے والا نہ تھا تکاثر آج اس گھر میں الو بول رہے ہیں۔ اور کوئی اتنا نہیں کہ چراغ جلا کر بیٹھ جائے کس برتے پر تتا پانی کس بات پر پھولی، اور کیا سمجھ کر پھولی، جو کچھ کرتی اور دیتی وہ سب تیرا امانت ہوتا اور آج ہم تجھ کو تیری امانت دوگنی اور چگنی واپس کرتے، دیتے اور اتنا دیتے کہ تو خوش ہو جاتی مگر تو تو ہمارے نام سے ایسی بیزار ہوئی کہ مر گئی اور ہم کو جھوٹوں یاد نہ کیا۔

کچھ معصومین کے برتاؤ کا دھیان ہے؟ آج ہم وہی برتاؤ تیرے ساتھ کریں گے تو نے اس کو بیٹی کی طرح رکھنے کا وعدہ کیا تھا اور اس کا ننھا سا دل باغ باغ تھا

مگر اے سنگدل تو نے اس کی بڑی مٹی پلید کی اور ذرا سے کلیجہ پر بڑے بڑے داغ دیئے اس ایک معمولی سی پھنسی پر تو نے محلہ کا محلہ سر پر اٹھا لیا اور وہ بخار میں ہلہلاتی آفت زدہ بچی جو تیرے حکم پر پان سیر کا بوجھا اٹھا کر لائی، صرف پانوں پھسل جانے پر اس سزا کے قابل تھی کہ وہ کمزور لہولہان ہو جائے، وہ بھی تو تیری طرح جان رکھتی تھی۔ صرف اتنا فرق تھا کہ تو زبردست تھی وہ کمزور تو اختیار والی تھی، وہ مجبور، مگر اس وقت تو ایسی عدالت میں موجود ہے جہاں کا حاکم تجھ سے زیادہ زبردست اور جس کا فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا معصوم کا دل مجروح اس بارہ میں تجھ سے زیادہ پیارا ہے اور یہ اسی سات برس کی لاوارث بچی اور تیری دست نگر لونڈی کی خاطر ہے کہ تو اس سخت عذاب میں پڑی ہے۔ اٹھ اور جو کیا اس کو بھگت"

(صبح زندگی ص ۱۵۵-۱۵۶)

نصوح کا خواب توبۃ النصوح میں جو لوگ پڑھ چکے ہیں اُمید ہے کہ اسے بھولے نہ ہونگے اتنے مؤثر خواب کوئی بھلا دینا چاہے بھی تو بھلانا آسان نہیں ہے ———— کون جانتا تھا کہ خواب آخرت کے اس نقش اول کا نقش ثانی تیس پینتیس سال کے عرصہ میں نذیر احمد ہی کے خاندان کے ایک رکن کے قلم سے نکل آئے گا؟ تقابل و موازنہ یہاں منظور نہیں بتانا صرف یہ، اور جتانا صرف اس قدر ہے کہ مشرق کے افسانہ نویس کی "صبح زندگی" بھی میدان حشر کے کیسے کیسے، مؤثر مناظر اپنے دامنوں کی تہ میں رکھتی ہے اسفزادب، افسانہ و محاضرت اس دنیا اور اس ملک کے اور جس حصہ میں بھی افسون کی گولیوں کا کام دیتے ہوں" نیصری گھرانے کے ایک مرد "راشد" کے ہاتھ میں آکر تو وہی زہر عین تریاق بن جاتا ہے اور جس پر دھوکا برابر غفلت کا تھا، نہ ہی صور بیداری نکلا!

جس روداد حیات کی "صبح" کے مناظر یہ ہوں اس کی "شام" کے مناظر کیا کچھ نہ ہوں گے؟ نصیرہ ایک خوشحال گھرانے کی بیگم ایک ڈپٹی صاحب کی بیوی ہے، لڑکے کا ختنہ کیا، عین دھوم دھامی تقریب کے دن، سوتیلے لڑکے کو ڈپٹی صاحب کے ہاتھوں بالکل بلا وجہ بتقصیر

بے انتہا ارکھیلا چکی اور جنگل میں پھنکوا چکی ہے۔ لڑکا بھی کون؟ سگی بہن کا لڑکا، اپنا سگا بھانجہ جس کی ماں ڈپٹی صاحب کی پہلی بیوی تھیں اور لڑکے کا سن ابھی کوئی چھ برس کا۔ رات اندھیری جنگل میں بارش زور شور کی ہو رہی تھی، آدھی رات کے سناٹے میں ایک سنپ آکر معصوم بچے کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اب اس کے آگے کا قصہ۔ قصہ نویس کی زبان سے سنیئے:۔

یہ وہ وقت تھا جب نصیرہ بیگم کا گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھر رہا تھا میراثنیں ٹھیک ٹھیک کر گا رہی تھیں۔ نصیرہ دن بھر کی تھکی ہاری، دو دن کی جاگی۔ اس خیال سے کہ ذرا کمر سیدھی کر لوں اپنے پلنگ پر جا لیٹی لیٹتے ہی سامنے کی دیوار پر روشنی میں ایک انسانی صورت دیکھی گھبرا کر اٹھی، ڈری اور پوچھا "کون -؟"

روشنی، میں تیری حقیقی بہن وا کرہ بدنصیب کی روح ہوں، اور مظلوم و معصوم ساجد کی ماں، تجھ کو یہ عیش کی گھڑیاں مبارک، تیرے لال کے کپڑے بنیں، تیرا سہاگ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے تو دودھوں نہائے، پوتوں پھلے، مگر نصیرہ میری محبت اور خدمت اس کی مستحق نہ تھی جو تو نے میرے لال کے ساتھ کیا۔ تو بیگم ہے اس گھر کی مالک ہے مجھے تجھ سے کچھ کہنے کا حق نہیں، میں اپنی زندگی پوری اور اپنی دنیا طے کر چکی، میرا نمونہ تیرے سامنے ہے میں ہمیشہ مظلوموں سے ڈری مصیبتوں سے جھکی یتیموں سے ملی رانڈوں سے مجلی، غرض میری زندگی کا مقصد صرف بندگان خدا کی خدمت اور حاجتمندوں کی اعانت رہا۔ پھر بھی میں سدا خوف سے کانپی اور موت سے لرزی، میرے پاس مغفرت کا کوئی سامان نہ تھا۔ دوزخ کے شرارے اور آگ کی لپٹیں مجھے جھیلنے کو تیار تھے، قبر اپنا منہ کھولے مجھے نگلنے کو موجود تھی تم سب عزیزوں نے مجھے نہلا دھلا کر رخصت کیا اور میری تمام محبت ختم کر دی مردوں نے مجھے سپرد زمین کیا اور اپنا منہ موڑا بڑا نازک وقت تھا۔ میں تھی اور عمر گذشتہ کے ہر فعل کی جوابدہی، ہر عمل کی باز پرس،

ہر کام کی ذمہ داری، ہر قول کی جانچ پڑتال۔ نمازیں دکھاوے کی تھیں۔ اکارت گئیں، روزے زبردستی کے تھے بیکار نکلے۔ ہاں اس آڑے وقت میں جب کوئی یار و مددگار نہ تھا کچھ یتیم لڑکے۔ کچھ معصوم بچے، تھوڑی رانڈیں، چند مظلوم بعض محتاج جن کو آج دنیا حقارت سے دیکھتی اور نفرت سے رکھتی ہے، میری مدد کو دوڑے یہ پاک روحیں عالم بالا میں راج کر رہی تھیں۔ ملک عدم میں ان کا سکہ چل رہا تھا اور اس جہاں کی بادشاہی ان کے قبضہ میں تھی۔ یہاں یہ میرے دست نگر تھے وہاں میں ان کی محتاج تھی اور ذوالجلال کی پاک ذات ان میں شامل تھی انھوں نے میرے سلوک کا معاوضہ اور میرے رحم کا بدلہ دیا۔ دوزخ ان کے اثر سے خاک اور شعلے ان کے اشارے سے ٹھنڈے ہوتے تو میرے واسطے گلزار بنی اور میری گنہگار روح جنت الفردوس میں جا پہونچی۔ آج مجھے حکم ہوا تھا کہ میں اس ناپکار دنیا کی کیفیت دیکھوں اور اپنے پیارے ساجد کی روح کے استقبال کو آؤں میں نے جو کچھ کیفیت دیکھی بیان نہیں کرسکتی آج تیرے بچے کی شادی ہے اور تو بیگم بنی بیٹھی ہے نوکر تیری ہوں پر حاضر ماما ئیں تیرے اشارے پر موجود اور شوہر تیرے اشارہ پر تیار ہے لیکن بیوقوف بیگم! خدا کی ایک مخلوق، ایک بھولا بھالا بچہ، بن ماں کا لال بے وارثہ معصوم اور تجھ جیسی بااختیار عورت کا مظلوم تیرے چہیتے باپ کے ہاتھوں جنگل بیابان میں دم توڑ چکا کیوں بیگم! حقیقی باپ اور سگی خالہ یوں عیش کرے اور ساجد آدھی رات کے وقت سنسان جنگل میں اس قیامت خیز بارش میں اکیلا پڑا ہوا دنیا کو الوداع کہے، تیرا بچہ اکیلا دالان سے باہر نہ نکلے اور میرا بچہ تیرے ہاتھوں زندگی کی آخری رات اس طرح بسر کرے، تیرے دولہا کے واسطے سینکڑوں آدمی موجود ہوں اور ساجد کے مردے پر کوئی دو آنسو گرانے والا بھی نہ ہو۔ دیکھ یہ میرے ہاتھ میں تیرا اعمالنامہ ہے، جہاں مظالم کے سوا ایک بھی نیکی نہیں ادھر دیکھ یہ موت تیرے واسطے منہ چیرے کھڑی ہوئی۔ نصیرہ بیگم جو ہونا تھا سو ہو گیا ساجد کی روح جنت میں جا پہونچی۔ اب تیرا اس کا فیصلہ حاکم حقیقی کے سپرد ہے،

اور وہ وقت دور نہیں جب دنیا تجھ جیسی ناشاد، نامراد، ظالم و مکار عورت کو اپنے سے جدا کر دے اور تو اس کا نتیجہ بھگتے، (شام زندگی صفحہ ۱۵۰-۱۵۰)

اقتباس یقیناً طویل ہو گیا لیکن کون دل والا ہے جو اکتا کر ایسی طوالت کو ختم کرنا چاہے گا؟ — اللہ کی بیشمار رحمتیں نازل ہوں اُس انشاپرداز کے قلم پر جس نے یوں گدگدا گدگدا کر رلایا۔ کتنے بگڑے ہوئے گھرانے اس تحریروں سے سدھر گئے ہونگے اور ظلمت کدوں میں انسانیت اور خدا ترسی کی شعاعیں انھیں روزنوں سے پہونچی ہوں گی۔ اور افسانہ نویس کے اجر بے حساب کا حساب اور فرد بے اندازہ کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

اُردو میں لکھنے والے، ناول اور افسانہ لکھنے والے بھی، ایک سے بڑھ کر ایک۔ اب تک ہو چکے ہیں۔ کسی نے کردار نگاری کا حق ادا کیا۔ کسی نے لطف زبان کا سماں باندھ دیا کسی نے ہنسایا کسی نے ڈرایا۔ لیکن اگر دائرہ انتخاب کو محدود کر کے سوال یہ کیا جائے کہ زندگی کی منظرنگاری میں موت کی مصوری اور آخرت کی عکاسی کس نے سب سے زیادہ کی؟ تو جواب کئی نہیں ہوں گے صرف ایک ہوگا زبانوں پر نام متعدد نہیں صرف ایک راشد الخیری کا آئے گا۔ موت کے کیسے کیسے نقشے اس عبرت نگار قلم نے زندگی میں دکھا دیئے؟ نہیں یہ وصف بھی غلط بیان ہوا۔ کہنا یہ چاہیے کہ موت میں کس کس طرح زندگی پیدا کر دکھائی، اور جو موضوع تمام تر خشک و بےمزہ سمجھا جاتا تھا اس میں کس درجہ لذّت، درد و چاشنئ غم کوٹ کوٹ کر بھر دی! روتے روتے سسکیاں بندھ جائیں اور پھر نہ کتاب چھوڑنے کو جی چاہے اور نہ ورق اُلٹے الٹا جائے اسے اگر بندہ کا اعجاز اور مولیٰ کا انفضال نہیں تو اور کیا کہئے؟

لکھنے والے نے ہزار ہا صفحے لکھ ڈالے اور کوئی درد و عبرت کے منظروں کا استقصار

کرنے بیٹھے تو صد ہا صفحات بھی اس کے لیے کافی نہ ہوں گے۔ اور یہ یہاں مقصود نہیں اس وقت مقصود تو مصورِ غم کی مصوری پر ایک سرسری تبصرہ اور اس کا اجمالی تعارف تھا۔ بوتیں آپ نے بہت سی دیکھی ہوں گی صحبت بہ خاست ہونے سے قبل، آئیے ایک موت مصورِ غم کی میت و رہبری میں بھی دیکھتے چلیں۔

نسیمہ ایک نیک دل بیوی ہیں۔ خالق کی فرمانبرداری اور مخلوق کی خدمت گزار، صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی سب انھیں خاتون کی زندگی کی "صبح" و "شام" و "شب" کی ایک مسلسل روداد ہیں۔ ۵۵ برس کے سن میں ان کا وقت آخر ہو رہا ہے دیکھیے مسلمان کی موت بھی کیسی حیات بخش ہوتی ہے۔ البتہ تجہیز و تکفین میں ذرا دیر لگے گی طبیعت اس انتظار میں ملول نہ ہو۔ مرنے والی نیک دل بیوی کو موت کا یقین ہو چکا ہے سب عزیزوں، قریبوں، کو پاس بلا کر بٹھواتی ہے اور زبان کہنا چاہیے کہ آخری بار یوں گویا ہوتی ہے،

"آج یہ پانوں جن پر گھمنڈ تھا بیکار رہیں۔ اور عمر جس پہ ناز تھا ختم ہو گئی ہے مگر اس کی یادگار آج ندامت و پشیمانی میرے پاس ہیں اور اب رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں اماں جان کی نصیحتیں میں نے سنیں ابا جان کے حکم بارہا میں نے ٹالے بہن بھائیوں پر شفقت مجھ سے نہ ہوئی بڑوں کی طاعت میں نے نہ کی، آہ عمرِ گزشتہ! اس کٹھن رستہ میں جہاں ایک ایک قدم اٹھانا مصیبت ہے تو نے عتاب کا ایسا انبار سر پر رکھ دیا کہ کسی طرح ہلکا نہیں ہوتا، ماما ئیں مجھ سے ناخوش، لونڈیاں مجھ سے نالاں، نوکر مجھ سے پریشان۔ الٰہ العالمین! الاماں الاماں! اس وقت نسیمہ کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور بیویوں میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جو نہ رو رہی ہو کچھ ضبط کیا اور پھر سلسلہ شروع کیا۔ کل کی بات ہے کہ پھوپھی جان نے مجھ کو پالکی میں سوار کرایا اس وقت بیسیوں عورتیں سفید بالوں والی مجھے رخصت کرنے میں شریک تھیں۔ آج وہ سب قبروں میں جا سوئیں اور میرا سارا سر سفید ہو گیا یہ انقلاب قدم قدم پر مجھے موت کا سبق دے رہے تھے لیکن غفلت کی انتہا، بےخبری

کی حد کہ کبھی بھولے سے بھی موت کا خیال نہ آیا پندرہ برس کی بیاہی آئی چالیس برس اس محلہ میں رہ چلی، مگر ایک کو بھی پوری طرح خوش نہ کر سکی، اماں جان اللہ غریق رحمت کرے کون کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے خوش گئیں یا رنجیدہ، رابعہ، ہاجرہ دونوں نندیں میرے سپرد تھیں مگر ان کا حق خدمت کچھ بھی ادا نہ ہوا ہے موقعہ گھڑکا، بلا وجہ ڈانٹا، بے سبب خفا ہوئی۔ خواہ مخواہ بگڑی اب نہ کہتی ہوں تو اس غصہ میں اصلاح کا خیال کم اور نفسانیت زیادہ تھی مگر مجھے ان بچیوں کی سعادت مندی سے امید ہے کہ یہ مرنے بھاوج پر عذاب نہ ہونے دیں گی اور عند اللہ میری غلطیوں کو معاف کر دیں گی"۔

نندیں یہ سنتے ہی چیخیں اور کر بھاوج کے قدموں پر گر پڑیں اور کہا خدارا بھابی جان! یہ نہ فرمایئے آپ نے ہماری ماں کو ہمارے دل سے بھلا دیا آپ نے ہم کو انسان بنایا اور ہم آپ ہی کی بدولت دنیا میں رہنے کے قابل ہوئے دونوں نندوں کو نسیمہ نے گلے لگا لیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا کہنے کی ایک دو نہیں بیسیوں اللہ کی بندیاں میرے رحم کی مستحق تھیں، محلہ کی بہت سی مخلوق بھوکی سوئی اور میں نے پیٹ بھرے۔ مسافر میرے در سے خالی گئے یتیم میری چوکھٹ سے ناکام پھرے۔ رانڈوں نے اس بندہ نوالی زبان سے تعریفیں نہیں بڑی بوڑھیوں نے میرے طعنے سہے۔ نوکروں نے میرے غصے اٹھائے ہائے اللہ گناہوں کی گٹھری اتنی بڑی: رحم آقا رحم!! ایک سفید آواز نکلی "اے بیگم، تیرے روئیں روئیں میں خدا جان دے ہم کو بیکس نہ چھوڑ یتیموں کا باپ تو رانڈوں کی وارث تو، اپاہجوں کا سہارا تو، مفلسوں کا گزارا تو اے بیگم تو"۔

نسیمہ اس کے بعد کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر تکان زیادہ ہوئی بخار شدت سے بڑھا اور بولنے کی ہمت نہ رہی بیویوں نے اس کی بلائیں لیں بچوں نے اس کو دعائیں دیں، شام قریب تھی بیویاں روتی دھوتی اپنے گھروں کو سوار ہوئیں دوسرے دن رات کے نو بجے بخار کچھ ہلکا ہوا تو نسیمہ نے تسیم کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"خوش نصیب ہوں میں بیوی کہ تمہارے ہاتھوں پیوند زمین ہوتی ہوں، جس چہرہ سے گھونگھٹ اٹھایا تھا اس کو اپنے ہاتھ سے خاک میں چھپا دینا سیاہ بال تمہارے گھر میں سفید ہوئے، اور جوانی تمہارے سامنے بڑھاپے سے بدل گئی، تم آقا تھے میں کنیز تھی تمہارا رتبہ زیادہ اور حق بڑا تھا۔ مگر ہزاروں مرتبہ بگڑی ہوں اور بُرا بھلا کہا ہے۔ آج اپنے بچوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں اپنی عنایت سے اس کو معاف کر دینا تاکہ خدا کے حضور میں تمہاری گنہگار نہ ہوں، تسیم بیوی کی زبان سے اتنا سنتے ہی بیتاب ہوا۔ روتا ہوا اٹھا اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے اور کہا تم جیسی بیوی دنیا چراغ لے کر ڈھونڈھے تو نہ ملے گی تم نے وہ کیا کہ میرا دل تم کو دعائیں دے رہا ہے تم نے مجھ کو پچاس روپیہ کی نوکری سے صدرالصدور بنایا۔ اور جس گھر میں گتے لوٹتے تھے تمہارے دم سے آج گلزار بنا ہوا ہے۔ میرا منہ نہیں کہ تمہارا شکریہ ادا کر سکوں ہاں میں تم سے نادم ہوں۔ اور اس خیال سے جو جلوں میں میں نے کیا میری روح کانپ رہی ہے۔ نسیمہ بیگم! اپنے بچوں کا صدقہ امرے ہوئے وسیم کا صدقہ اب مجھے معاف کردو" نسیمہ نے شوہر کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا، اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا خدا بر حق تم کو معاف کرے میں پہلے ہی معاف کر چکی ہوں۔ اب پھر کہتی ہوں میں نے معاف کیا۔ اب میں تم سے اس قدر اور کہتی ہوں اگر میرے بعد ضرورت تم کو دوسرے نکاح پر مجبور کرے تو بیشک کر لینا میں منع نہیں کرتی، لیکن دو معصوم بچیاں تمہاری محتاج چھوڑتی ہوں لڑکے سیانے ہیں اور کماتے ہیں مگر یہ بھولی چڑیاں سوتیلی ماں کے قبضہ میں نہ جائیں تسنیم ان کی پرورش کرے گی ان کا کھوا چھوٹنے کے بعد تسنیم سے بہتر رفیق ان کا کون ہو گا وہ دشمنی میں ان کی دردست اور بدخواہی میں انکی بہترین خیر خواہ ہو گی۔ تمہاری تنخواہ میں سے جو کچھ بچکر آج تک جمع ہوا ہوا ہے وہ یہ دس ہزار کے نوٹ ہیں جوان دونوں کی شادی کے واسطے محفوظ تھے اور اب تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ بچے ہوشیار ہیں مگر میرے بعد دیوار سے سر پھوڑیں گے ان کو

کلیجہ سے لگا کر رکھنا اگر میدان حشر میں ملاقات ہوئی ہے تو تم سے اپنے بچوں کے دُکھ کا حال
ضرور کروں گی۔"
(شام زندگی صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۲)

نسیمہ کے جسم و روح پر جو کچھ گزری اس کا اصل حال تو اللہ جانے یا اس کے فرشتے
باقی شاعر کی طرح افسانہ نگار کو بھی کبھی کبھی الہام ہوتا رہتا ہے۔ اور عجب نہیں کہ ایک مومنہ
کی وفات کی منظر نگاری کے وقت مومن راشد پر بھی الہامی لمحوں کی بارش ہو رہی ہو۔

"نسیمہ پر جس وقت مرض الموت کی بے ہوشی طاری ہوئی اور دماغ نے یادِ وسیم کے سوا
تمام تعلقات کو خیرباد کہا اور خیال کی تمام قوت اسی لال کی طرف ڈھل گئی جس کی تصویر کھاتے
پیتے سوتے جاگتے آٹھوں پہر دن اور رات آنکھوں کے سامنے رہتی تھی تو کانوں نے شوہر کے آخری
الفاظ سنے اور زبان نے یہ جواب دے کر کہ "میرے لال کی روح میرے استقبال کو آئی ہیں
اکیس سال کے واسطے کو جو بالآخر فنا ہونے والا تھا ختم کر دیا اب ان بیجوں کے پھل جو دنیا
میں بوئے ان معاملات کے نتیجے جو تعلقات میں برتے ان کاموں کے انجام جو زندگی میں کئے
آنکھ کے روبرو تھے روح جس کی بدولت جسد خاکی اچھل کود رہا تھا رگ رگ سے وداع
ہو رہی تھی پنڈلی پنڈلی سے لپٹ رہی تھی ہاتھ سے ہاتھ چھٹ رہا تھا اور موت جس کو زندگی
بھول کر یاد نہیں کرتی اس مہین کپڑے کی طرح جو خار دار جھاڑی پر ڈال کر گھسیٹا جائے نازک
جسم سے جان نکال رہی تھی۔ کتنا نازک وقت تھا کہ بچے جہان کے نام کے عاشق تھے معدود
گھڑے اس کا دم دا پسیں اور شوہر جو بیوی کی صورت کا پروانہ تھا مجبور بیٹھا اس کی مفارقت
ابدی دیکھ رہا تھا۔ گھر کا کونہ کونہ اور زندگی کا ذرہ ذرہ باآواز بلند صدا دے رہا تھا کہ
کنوار پنے کی آزمائش اور سسرال کے امتحان کا نتیجہ آج برآمد ہوتا ہے۔ زندگی فنا ہوتے
ہی کانٹوں سے پٹا میدان یا پھولوں بھری سیج پیش کر دے گی اور یہ راحت ابدی یا
مستقل عذاب دوسروں کے واسطے عبرت یا سبق مگر چند لمحہ میں ختم ہو گا۔ پیشانی پر بل
آئے، اذیت کی آوازیں نکلیں مگر یہ عارضی تکلیف قطع تعلق کا اثر تھا روح نکلتے ہی دیکھو

کیا ہے کہ دونوں کلیجے کے ٹکڑے نسیم اور وسیم جن کے مکھڑوں کو آنکھیں ترس گئی تھیں اور جو سفید کفن میں لپٹے لپٹائے ماں کی آنکھوں سے رخصت ہوئے جھلا جھلی کپڑے پہنے ہشاش بشاش گردن جھکائے کھڑے ہیں آنکھیں جن صورتوں کو تلاش کرتی تھیں دل جن پیاروں کو ہر جگہ ڈھونڈھتا پھرتا تھا جو آنکھوں کے سامنے جاندار سے بے جان ہو کر گہری گوردوں میں سو چکے تھے جن کی ہڈیاں تک گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ جن کی قبریں تک دھنسنی شروع ہو گئی تھیں ان کا اس وقت نظر آنا موت کی پہلی کامیابی تھی ٹھٹکی اور گم سُم کھڑی ہو گئی کہ ملک الموت نے کہا۔

"خالق کے احکام کو سچے دل سے بجا لانے والی مخلوق! تیرے لال موجود ہیں۔ بیتاب ہو کر آگے بڑھی نسیم دوڑ کر ماں کے قدموں میں لپٹا اور وسیم نے اپنی گردن ماں کے سینے سے لگا دی دونوں کو کلیجے سے لگا لیا اور سجدہ میں گر پڑی۔ اب فرشتۂ موت آسمان کی طرف اڑا نسیمہ قدم قدم پر خدا کی رضامندی کے آثار پا رہی تھی۔ وہی در و دیوار جو قبل از رحلت اس کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے اس وقت مبارک باد میں سرگرم تھے ہوا مرحبا کے نعرے لگا رہی تھی اور درخت کامیابی کی صدائیں دے رہے تھے پھولوں نے اس کی زندگی سراہی پتوں نے اس کے اعمالنامے سنائے، بلبل نے اس کے کام بیر دہرائے اور طوطی نے اس کے نام کا کلمہ پڑھا جشم زدن میں یہ منظر ختم ہوا اور اب وہ وقت آیا کہ نسیمہ بیگم کی پاک روح خالق الموجودات کے حضور میں حاضر ہو لطیف رُوح غسل کی محتاج نہ تھی ایک حور سامنے آئی اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رضائے الٰہی کا ایک بے بہا جھومر اس کے ماتھے پر لگا لیئے قدموں پلٹ گئی اب فرشتۂ موت جگمگاتی روح کو لیے ہوئے دوسرے مقام پر پہونچا یہاں حوروں کی صفیں قطار در قطار استقبال کو موجود تھیں سب نے بالاتفاق خوش آمدید کا نعرہ لگایا۔ ایک ممتاز حور سامنے آئی اور سر سے پاؤں تک ہیرے اور جواہرات کے زیور پہنانے شروع کئے وہ پہناتے وقت آواز بلند

کہتی تھی کہ یہ جڑاؤ گلوبند شوہر کی رضامندی کا صلہ ہے اور ہیرے کے کنگن اس لیے
ان ہاتھوں میں پہنائے جاتے ہیں کہ یہ اپنے جسم سے زیادہ مخلوق کے کام آئے۔ والدین
کی فرمانبرداری اور بزرگوں کی تعظیم کا انعام یہ موتیوں کی مالا ہے۔ رشب زندگی حصۂ ول ختم
نیبہ کے پیکر خیالی پر جو کچھ نوازشیں ہوئیں انھیں تو مستورغم کی نگاہ کشفی نے دیکھ
لیا لیکن خود اس مبصرالم کی جو کچھ سرفرازیاں اُس دربار میں ہو رہی ہوں گی جہاں نہ کسی کی
مخالفانہ تنقید کا اثر پہنچ سکتا ہے اور نہ کسی کی معاندانہ تنقیص کا ان کا احاطہ کس بندۂ خاکی
کا تصور، کس بشر کا تخیل کر سکتا ہے؟

مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ
وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِۨ ادْخُلُوْھَا
بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝
لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْھَا وَ
لَدَیْنَا مَزِیْدٌ ۝

جو شخص بھی دنیا میں بن دیکھے خدائے رحمٰن کی خشیت رکھتا ہوگا اور قلب
منیب (رجوع ہونیوالے دل) کے ساتھ حاضر ہوگا۔ اسکو حکم ہوگا کہ
داخل ہو جاؤ اس جنت میں امن و راحت کے ساتھ اور یہ یوم عیش
لازوال ہے جس کے ختم ہو جانے کا اندیشہ نہیں ایسوں کے لیے سب کچھ
ہے جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس تو ان چیزوں سے بھی بڑھکر نعمتیں ہیں۔

دنیا والے تو اس کو منتہائے فکر سمجھتے ہیں کہ جو مانگو وہ مل جائے یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ
اس منتہائے فکر سے بھی آگے کچھ مل کر رہے گا۔ جہاں تک ذہن رسا کی بھی رسائی نہیں ہوتی وہ
سب کچھ بھی انھیں مرحمت کر دے گا! اللہ اللہ! یہ کن کو؟ ہاں ان کو جو قلب منیب رکھتے
ہوں جن کے دل میں خشیت الٰہی ہو اور پھر اس بندہ کے انعام و اکرام کا پتہ نشان کون بتائے
اس کا اندازہ و حساب کون لگائے جس کی خشیت لازمی سے بڑھ کر متعدی ہو یعنی صرف
اپنے ہی قلب میں نہیں رہی، بلکہ اس نے دوسروں کے قلب میں بھی پیدا کر دی اور
جس کے قلم نے "موت" میں "زندگی" پیدا کر دی!

---

(۶)

ایک بزمِ مشاعرہ کی غیر شاعرانہ صدارت[۱]

بزمِ مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اس کا صدر ایک دیہاتی اور دیہاتی بھی کیسا زبان و ادب کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر و سخن کے باب میں محض غبی! داد بانیٔ مشاعرہ کی خوش طبعی کی دیجئے۔ سبحان اللہ! کیا خوب نظرِ انتخاب پڑی ہے! ان کی قلمی ظرافت سب پر روشن و آشکار۔ لیکن حقیقت میں آج کی عملی ظرافت ان کا شاہکار! دنیا کی نظر میں وہ محض ایک ظریف لیکن میرے حق میں تو ستم ظریف! یہ صدارت کیا ہے قحط الرجال بلکہ نیرنگیٔ دہر کا ایک کھلا ہوا نشان اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانہ کا گمان! بلکہ یوں کہئے کہ فسانۂ عجائب کا کوئی لطیفہ نہ ایڈیشن اگر صاحب "کائنات"[۲] کی سرپرستی میں طبع ہو تو اس کے لیے ایک موزوں عنوان!

صدر اور صدارت کا نام آتے ہی ذہن منتقل ہوتا ہے "خطبۂ صدارت" کی جانب بلحاظ ضخامت طویل و عریض، بلحاظ ادب و انشا فصیح و بلیغ، و بلحاظ معانی و [illegible]

---

۱ یہ مشاعرہ ۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو شب میں دفتر حق و صدق (لکھنؤ) میں ملک کے مشہور مزاحیہ نگار شوکت تھانوی کی دعوت و تحریک پر ہوا تھا ۲ ایک ماہنامہ جو شوکت تھانوی کی ادارت میں اس وقت لکھنؤ سے نکل رہا تھا۔

عمیق، اور بلحاظ تحقیق فن دقیق۔ سامعین با تمکین مطمئن رہیں کہ اس قسم کی بحر طویل میں کوئی فکر سخن ان کی خدمت میں ہرگز نہ پیش کی جائے گی اور نہ وہ چار منٹ سے زائد نہیں تکلیف دی جائے گی۔ نہ شاعری کی کشف و ماہیت پر سوز مرانہ کا لی داس کے حوالوں سے کوئی فاضلانہ تبصرہ اور نہ اردو شاعروں کا ولی دکھنی کے زمانہ سے شروع کر کے کوئی ناقدانہ تذکرہ! مختصر سی سامعہ خراشی جو کی جا رہی ہے وہ بھی محض اس ارشاد کی تعمیل میں خطبۂ صدارت کے نام سے کچھ نہ کچھ ہو ضرور۔ گویا یہ بھی فرض ہے کہ بلبلوں کی نوا سنجیوں سے قبل کچھ دیر زاغ آشفتہ نوا سے بھی لطف اٹھا لیا جائے۔

یارانِ بزم! محفل مشاعرہ اور تقویم مسیحی کی بیسویں صدی! اور اردو شاعری کی پرانی دھرانی بزم، اس ترقی و تجدید کے زمانہ میں! یہ وقت ہے سینما کا، تھاکیز کا، آپیرا ہاؤس کا، ریڈیو کا، میوزک ہال کا، کارنیوال کا، یا آپ کے فن عروض کا، قصائد حمد و نعت کا، منقبت کا، مناجات کا؟ آپ مشاعرہ غریب کی پرستش آج ہے کس دربار میں؟ آپ کے شاعروں کے لیے عزت کی کرسی اس وقت ہے کس سرکار میں؟ مشرق کے خلاف جو بغاوت خود مشرق سے کرائی گئی ہے اور آپ کے گھر میں جو آگ گھر والوں کے ہاتھ سے بھڑکائی گئی، وہ ناتمام اور ادھوری رہی جاتی تھی اگر اس کا رخ مشرقی شاعر کے بھی خلاف نہ ہوتا۔ آپ باغی بنائے گئے اپنے آبا و اجداد سے، اپنی تہذیب و معاشرت سے، اپنی وضع و لباس سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنے دین و اخلاق سے، اور اگر سب سے بڑھ کر نہیں تو اور کسی شعبۂ زندگی سے گھٹ کر بھی نہیں، اپنے شعر و ادب سے! آپ کی شاعری فرنگیت کے پیمانے سے نپنے لگی۔ اسی میزان میں تلنے لگی اور فیصلہ یہ صادر ہو گیا کہ اردو شاعری میں رکھا کیا ہے؟ بجز ہزل اور تخریب اخلاق کے اس میں ہے کیا؟۔

گویا بائرن انگریزی کا نہیں اردو کا شاعر ہوا ہے اور شکسپیر نے "لکریشیا"

فرنگستان میں نہیں دہلی یا لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھی ہے، مکالمے اور مکالے کے بعد آنے والوں نے ہمارے ادب سے متعلق جو گہرافشانی کی ہے کیا ہم اسے بھول گئے ہیں؟ اور آہ کہ ان بیگانوں کے ساتھ اپنوں کی بھی زبانیں جس طرح اپنی زبان، اپنے ادب، اپنی شاعری پر کھلی ہیں، آسے ہم بھلانا چاہیں بھی تو کیونکر بھلا سکتے ہیں؟

آج جب کہ نہ دتی کی سرکار ہے، نہ اودھ کا دربار۔ اور شاعروں کی قدر اس کی آدھی دہائی بھی نہیں جتنی ناٹک کے گوتوں اور سازندوں اور سینما کے بھانڈوں اور نقالوں کی ہے، آفریں ہے آپ کی ہمت پر جواب بھی آپ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کی یاد کو سینہ سے لگائے کلیجہ سے چپٹائے ہوئے ہیں، اور بجلی کے قمقموں کے دور میں اپنی شمع کافوری جلائے ہوئے ہیں۔ زندگی کے حقائق و معارف کی ترجمانی، ہر ہر دور میں فارسی اور اُردو کے شاعروں اور استادوں سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ شاعروں سے مراد جماعت کے حقیقی باکمال افراد ہیں ورنہ ننگ جماعت افراد کس طبقہ میں نہیں ہوتے؟ کون ایسا چمن ہے جس میں گل بغیر خار کے ہوں؟ آپ کے فخر کے لیے آپ کے بلند پایہ اسلاف معنوی کے کارنامے کافی ہیں۔ بلکہ کافی سے بڑھ کر وافی۔ کوشش کیجئے کہ ہر قدم انھیں کے نقش قدم پر پڑے، بلکہ حقیقت سنجی میں، حقیقت بینی میں حقیقت گوئی میں ان سے کچھ آگے ہی بڑھ کر رہے، اور دارالسلطنت دہلی پر اپنی یہ تاریخ ثبت کرا جائیے کہ آپ کے ہاں فیضی اور عرفی اس وقت بھی برابر پیدا ہوتے رہے، جب دربار اکبری مدت ہوئی برخاست ہو چکا تھا!

---

(۷)

ایک مختصر سا پیام

فیض آباد کے "اردو ڈے" منانے والوں کے نام

جو شہر "آباد" ہی "فیض" سے ہو زبان اس کے فیض سے کیسے محروم رہ سکتی ہے؟ اُردو کا تعلق فیض آباد سے آج کا نہیں، نسلوں اور قرنوں کا ہے۔ فخر لکھنؤ میر انیس اسی خاک کے تھے، نازش مثنوی میر حسن اسی سرزمین سے اٹھے جنت چکے۔ لکھنؤ جاکر، لیکن پیدا تو یہیں ہوئے تھے۔ پھر آپ کا شہر دار الحکومت بھی تو ملک اودھ کا رہ چکا ہے اور یہ معلوم ہے کہ زبان کی سرپرستی حصہ تھا ہمارے بادشاہوں کا اور اردو زبان کی تراش خراش نوک پلک حصہ رہ چکی ہے شاہی بیگمات کا۔ حق تھا کہ آپ کا شہر اردو کی نشر و اشاعت کا علم بلند کرے اور اردو کی خدمت میں کسی دوسرے شہر سے پیچھے نہ رہے!

لیکن آپ کا فرض اس پر ختم نہیں ہو جاتا ہے کہ سال میں ایک بار جلسہ کی چہل پہل

۱؎ جنوری یا فروری ۱۹۷۲ء ۲؎ یوم اردو کے بجائے اس وقت تک "اردو ڈے" چلا ہوا تھا۔

اور یہ اردو ڈے فیض آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے طلبہ منا رہے تھے۔

دکھا دی، باہر سے شاعروں، ادیبوں کو بلالیا۔ جلوس گشت کرادیا، کچھ نعرے لگا دئے، کچھ تقریریں سن لیں، یہ تو ادائے فرض کی صرف تمہید ہوئی کتاب کا محض دیباچہ ہوا عمارت کی محض نیو ڈالی گئی۔ اصل شئے ہے صالح لٹریچر یا "ادب شریف" کی تیاری، فراہمی، ترویج و اشاعت، ادب شریف سے مراد ہیں نثر اور شعر کی وہ ادبی خدمات جنھیں شریف مرد اور شریف بیویاں، شریف بچے اور شریف بچیاں ہر ملت اور ہر قوم کی پڑھ سکیں، پڑھا سکیں، سن سکیں، سنا سکیں، شریف سے مراد وہ نہیں جن کے باپ دادا شریف تھے، مراد وہ ہستیاں ہیں جن کی ذات و شخصیت پر خود شرافت کو ناز ہو، بلحاظ ان کے اقوال، اعمال، اخلاق، اطوار، رفتار و گفتار کے۔

بدمذاقی کو مٹائیے۔ صفائی کو، ستھرائی کو، پاکیزگی کو پھیلائیے۔ گندگی کے سیلاب میں بہنے سے، اپنے کو اور دوسروں کو بچائیے۔ اردو کا کتب خانہ قائم کیجئے۔ اچھے اچھے خوش مذاق اہل قلم کی کتابیں دیکھئے۔ شرافت کی روح ان کتابوں کے مطالعہ سے بیدار ہو۔ آپ کی جوہر شناسی کی ہر طرف پکار ہو۔

اُردو کو مسلمان اپنی زبان کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ان کی تو یقیناً ہے، لیکن ان کی ہی یقیناً نہیں، ایک اعتبار سے اگر اُن کی ہے تو دوسرے اعتبار سے ہندوؤں کی۔ زبان کے اسم اگر بہت سے عرب و ایران سے چل کر آئے ہیں تو اس کے فعل اور حرف ربط کہنا چاہئے کہ سب کے سب اسی دیس کے ہیں اور زبان کی ترکیب میں اسماء سے بھی کہیں بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں یہی افعال و حروف ربط۔ اور پھر اسم بھی سب کے سب باہر کے کہاں؟ خاصی بڑی تعداد تو ان کی بھی اسی دیس کی ہے۔

بس اس حقیقت کو خود بھی سمجھ لیجئے اور دوسروں کو بھی سمجھا دیجئے، ملک کی سب سے بڑی اُردو انجمن کے صدر آج بھی ایک ہندو ہی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو۔ خالص اُردو پندرہ روزہ پرچہ ہماری زبان کے ایڈیٹر بھی ایک ہندو ہی ہیں۔ پنڈت برجموہن

دتاتریہ کیفی۔ یو۔ پی کے رسالوں میں اُردو کا سب سے پرانا رسالہ اور سنجیدہ خادم ایک ہندو ہی کے ہاتھ میں رہا، اور اب بھی ہے یعنی زمانہ (کانپور) اُردو شاعروں کا سب سے بڑا ضخیم و مفصل تذکرہ ایک ہندو ہی کے قلم کا رہین منت ہے، لالہ سری رام، ایم اے دہلوی کا۔ چندر بھان برہمن، رتن سنگھ زخمی، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، نوبت رائے نظر، جوالا پرشاد برق، دوارکا پرشاد افق، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، دیا نرائن نگم، پریم چند، جذب حیدرآبادی، برج نرائن چکبست، اشیشور ناتھ منور، گوپی ناتھ امن، امرناتھ ساحر، آنند نرائن ملا، کرشن مہائے وحشی وغیرہ وغیرہ ــــ نام کوئی کہاں تک گنائے چلا جائے؟ ان کی خدمات اُردو کو نظر انداز کرنا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے، اور یہ نام تو صرف نمونہ کے طور پر پیش کر دیئے گئے پوری فہرست سنانے پر کوئی آئے تو آپ یقیناً پکار اٹھیں کہ "یہ اُردو ڈے" ہے یا "ہندو ڈے"!

آج اہل سیاست اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدۂ اتحاد ہو جائے لیکن اردو زبان تو خود ایک بنا بنایا مشترک پلیٹ فارم چلا آ رہا ہے، نسلوں سے، قرنوں سے، صدیوں سے! اس زبان کا نفس وجود ہی ایک مستقل معاہدہ ہے ہندو مسلم اتحاد کا، ہم جہتی اشتراک کا، کاغذی معاہدوں سے کہیں زیادہ پائدار اور سیاسی دستاویزوں سے کہیں زیادہ جاندار! جب ملک بھر کی زبان ایک، تو سبھی کچھ ایک، جب سارا ملک "ہم زبان"، "یک زبان" تو اب اور رہ ہی کیا گیا؟ زبان ٹھہری دل کی ترجمان۔ زبان ایک تو دل ایک۔

خوب ہو جو اس "دلی" اور "زبانی" معاہدہ کی یاد ہر سال منائی جائے، بھولے ہوؤں کو حقیقت کی یاد دلائی جائے۔ اردو کی محبت دلوں میں رچائی جائے۔ اور جو آگ ادھر کبھی سی ہو رہی ہے، وہ پھر سے بھڑکائی جائے۔

اُردو کی خدمت آج زبان ہی کی نہیں، ملک کی ہے، ملت کی ہے، قوم کی ہے،

ملّت کی ہے، اور خدمت بھی کیسی، ٹھوس اور قیمتی، بڑی اور اونچی! بس یہی ایک پیام ہے جو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ایک گمنام گوشہ نشیں۔ آپ تک پہونچا رہا ہے، آپ کا "ہم ضلع" نہ سہی آپ کا "ہم قسمت"[1] تو بہرحال ہے۔

---

[1] قصبہ دریاباد فیض آباد ہی کی کمشنری "قسمت" میں ہے۔

مرزا ثاقب[1]

بات ۱۹۱۲ء کی ہے جب اپنی طالب علمی ہی کہنا چاہیئے کہ پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کہ لکھنؤ کے خوش ذوق رئیس چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقہ دار گڑھی بھلول نے رقعہ لکھ کر مجھ سے دریافت کیا کہ ایک ادبی حلقہ میں ذیل کے دو ہم مضمون شعروں سے متعلق بڑی بحث چھڑ رہی ہوئی ہے، محاکمہ آپ کیجئے شعر دونوں یہ ہیں۔

(۱) شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو
سر ٹکرا کے در کر دیا دیواروں کو

(۲) شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

کم عمری تھی بادی النظر میں اور پہلی دفعہ پڑھنے میں شعر پہلا ہی اچھا معلوم ہوا۔ لیکن ذرا سوچنے سمجھنے اور ایک نکتہ سنج دوست سے مشورہ کرنے کے بعد ترجیحی رائے دوسرے شعر کے حق میں قائم ہوئی اور یہی میں نے چودھری صاحب کو جواب میں لکھ بھیجا۔ پہلے شعر میں لفظوں ہی کا زور ہے ورنہ اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے قید خانہ کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ

---

[1] روزنامہ تنویر مرحوم (لکھنؤ) ۹ نومبر ۱۹۲۶ء

کر محض ورکی طرح کھلی رہ جایئں حدِ فطرت سے بڑھا ہوا ہے، اور پھر جب زندان کی دیواریں ہی باقی نہ رہیں تو خود زنداں کا وجود کب باقی رہ گیا۔ قیدی آزاد ہو کر نکل ہی نہ بھاگیں گے۔

دوسرا شعر بے عیب ہے بلکہ کچھ کچھ تے انتہائی حسرت و بیکسی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ تاریکی اس بلا کی ہے کہ قیدی کو یہ خفیف سی روشنی بھی بہت غنیمت معلوم ہو رہی ہے پھر اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے دیوار میں کچھ ہلکا سا رخنہ پیدا ہو جائے حدود فطرت سے اس درجہ بعید بھی نہیں۔

غرض یہی رائے لکھ کر بھیج دی اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ پہلا شعر کس کا ہے اور دوسرا کس کا۔ چودھری صاحب تو خیر خوش ہو تے ہی دو ایک روز بعد یہ دیکھتا کیا ہوں کہ جناب میرزا ثاقب صاحب غریب خانہ پر تشریف لا رہے ہیں (میں اس وقت تک گویا لکھنؤ میں ہی رہتا تھا) آئیں! یہ مرزا صاحب کہاں؟ ان کی تو نازک مزاجی (نازک خیالی ہی کی طرح) مشہور ہے، یہ تو بڑے بڑوں کے ہاں نہیں آتے جاتے۔ مجھ غریب طالب علم کے ہاں (کالج میں نے ابھی زمانہ میں چھوڑا تھا) کہاں قدم رنجہ فرمانے لگے، میں تو دور سے راستہ گلی میں بھی ان کی صورت دیکھ لیتا تھا کبھی بڑھ کر ملنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ چہ جائیکہ انھیں اپنے گھر پر دیکھنا!

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

خیر بیٹھے تو فرمایا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں، چودھری صاحب نے آپ کا وہ خط مجھے دکھایا۔ آپ نے نقادی اور انصاف کا حق ادا کر دیا ورنہ وہ شعر تو میر۔ ۔ ۔ ۔ صاحب مرحوم و مغفور کا ہے ان کے سامنے بھلا مجھے کون پوچھتا!

میں نے یہ سن اپنے دل میں کہا کہ چلو اچھا ہوا اپنے کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ کون شعر کس کا ہے ورنہ بہت ممکن تھا کہ میر۔ ۔ ۔ صاحب کا نام سن کر مجھ پر بھی رعب پڑ جاتا اور

انھیں کے شعر کو ترجیح دینے لگتا۔

یہ تو دل نے کہا باقی زبان یہی الفاظ ادا کرتی رہی کہ محض آپ کی عزت افزائی ہے ورنہ میں کس لائق ہوں مجھے تو کہتے ہوئے شرم آرہی تھی کہ آپ حضرات اہل زبان کے معاملہ میں زبان کیا کھولوں۔

بس اُس روز سے ثاقب مہربان ہو گئے لکھنؤ کے شاعروں میں عزیز صاحب تو پہلے ہی سے مخلصانہ کرم فرماتے اور وہ تھے بھی طبعًا متواضع و منکسر مزاج۔ محشر صاحب وابر صاحب سے حضرت اکبر الہ آبادی کے طفیل میں سرسری نیاز حاصل ہو گیا تھا غنی صاحب، ظریف صاحب، اور سب سے بڑھ کر مرزا محمد سوا صاحب بھی عنایت فرماؤں میں تھے یہ ثاقب صاحب کا مہربان ہو جانا ان سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔

اسی صحبت میں خوش ہو کر اپنا کلام بھی زبانی سنایا۔ غزل کا مطلع کیا ہے دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں کے اندر حسن و عشق کی پوری داستان رنگین سمیٹ لی ہے ؎

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے　　جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

اور پھر جو ایک شعر ظالم نے پڑھا۔ اُس نے تڑپا ہی دیا ؎

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ　　ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شعر بلا ترنم کے تحت اللفظ پڑھتے لیکن ہاتھ اور چہرے کے اشاروں سے مضمون کی تصویر بھی کھینچتے جاتے۔ دوسرا مصرعہ جب پڑھا ہے تو آنکھیں ذرا بند کرکے سر کو ایک طرف اس طرح جھکایا اور ہاتھ کو اس کے نیچے اس طرح لائے کہ جیسے سچ مچ تکیہ پر سر رکھ کر سو ہی تو گئے ہیں! — اس ہیچمدان نے شعر کی تکرار اس کثرت سے دوستوں کے سامنے کی اور اپنی تحریروں میں اتنی بار استعمال کیا کہ اب وہ شعر بے تکلف سب کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔ ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت اس میں موجود ہی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم و مغفور (یاد کر لیجیے کہ وہ الفاروق کے مصنف تھے) شبہ

۹

پیام نوجوان علیگڈھ کے نام

نوجوان علی گڈھ ایک بار پھر آرزو کی خدمت پر آمادہ ہوا ہے۔ نوعمری کا جوش، کام کا حوصلہ، کارگزاری کا دلولہ۔ خدا ہمت میں بلندی اور ارادہ میں استقامت نصیب کرے۔ علم و حکمت کا درس جاری، ادب و انشا کی گرم بازاری، قلم شوخ نگاری پر آمادہ، زبانیں شگفتہ بیانی پر کمربستہ، یاران زندہ دل کی مجلس آراستہ، ایک گوشہ نشین مرد دل دہقانی کو حکم پہونچا ہے کہ اپنے عزلت کدہ سے نکل کر اس بزم میں حاضری دے!
زبان حیران کہ کس موضوع پر کھلے! تاہم اگر فرصت عنقا نہ ہوتی تو دل میں تھا کہ خود علیگڈھ ہی کی بھولی بسری کہانی جسے کو ہنسانے والی اور بہتوں کو رلانے والی، اور یونیورسٹی اور کالج کی داستان پاستان، کسی کے دل میں جوش پیدا کرنے والی اور کسی کے تیور پر بل ڈالنے والی، دانش گاہ کے دیرینہ سال بزرگوں اور کمسن خوردوں سکھانے

له زمانۂ تحریر، آخر ۱۹۲۶ء۔ انجمن اردوئے معلیٰ (مسلم یونیورسٹی) کے سہ ماہی رسالہ سہیل (مرحوم) کے پہلے نمبر میں

والے استادوں اور سیکھنے والے شاگردوں سب کو، ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور اکھڑے اکھڑے فقروں میں سنا دی جاتی۔ ممکن تھا کہ کہانی سنتے سنتے کوئی سو جاتا اور ممکن تھا کہ کسی کی نیند اڑ جاتی! لیکن فرصت عنقا تھا۔ مجبوراً محض معذرت نامہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ مختصراً صرف دو لفظ کہہ دیئے ہیں۔

سید احمد خاں (اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے) کی دینی و سیاسی تحریکات سے تعلق بڑا اختلاف رہا ہے اور شاید آیندہ بھی رہے۔ لیکن ان کی ایک خدمت ایسی ہے جس میں شاید کسی کو اختلاف کی گنجائش نہ ہو اور وہ اُن کی خدمت ادب و زبان اُردو ہے۔

اُن کی ادبی تحریک نے اردو نثر و نظم دونوں میں اصلاح ہی نہیں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور آج ادبیات اردو کا جو کچھ سرمایہ نظر آرہا ہے ذرا مبالغہ نہیں کہ وہ بہت بڑی حد تک سیدؔ اور ان کے رفیقوں ہی کی کوششوں کا ممنون کرم ہے۔ سر سید کے مضامین و تصانیف نے کہنا چاہیے کہ رفتار اردو کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ اردو زبان پہلے تکلف، تصنع و آورد کی ایک چیستان تھی اسے سادہ سلیس، بے تکلف، روزمرہ میں ڈھال دیا۔ سر سید کے زمانہ کے قبل کی اردو تصانیف کو پڑھا جائے اور پھر ان کے بعد کے آنے والوں محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی، شرر کی تحریروں سے مقابلہ کیا جائے تو بیّن فرق ہر شخص کو نظر آجائے گا اور اس کا اجر اگر سارے کا سارا نہیں تو کم از کم اسکا ایک بڑا حصہ یقیناً میکدۂ علیگڈھ کے اس پیر مغان کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ علیگڈھ کا سب سے بڑا کارنامہ اور سید احمد خاں کا سب سے بڑا ورثہ احقر کے نزدیک یہی ہے، مبارک ہیں وہ فرزندان علیگڈھ جنھیں اس ورثہ کو حاصل کر کے، اس میں اضافہ کرنے کی توفیق نصیب ہو! لیکن یہ یاد رہے کہ علیگڈھ سب سے پہلے "مسلم کالج" اور اب مسلم دار العلوم ہے۔ اور "مسلم" کا کام محض الفاظی و لفاظ تراشی نہیں، مسلم کی زندگی کا مقصد اقلیم معنی کو سر کرنا ہے۔ ہم وہ ہیں جن کو تعلیم [illegible]

لفظ بگزار ی سوئے معنی بروی

الفاظ قالب و پوست ہیں، یہ نہ ہو کہ ہم قالب و پوست کی جانب اس درجہ منہمک رہیں کہ مغز ہاتھ سے جاتا رہے، معنویت و حقیقت ہی ہمارا اصل مقصد حیات و مطلوب ہے۔ الفاظ اس مطلوب کے لیے محض لباس و پوشش کا حکم رکھتے ہیں، لباس کی خوشنمائی و دلآویزی بھی بجائے خود ضروری ہے لیکن اسی حد تک کہ جسم زیر لباس کو اذیت نہ پہنچنے پائے۔

عجمی و فرنگی قافیہ پیمائیاں بہت کچھ وقت ضائع کر چکیں۔ ضرورت ہے کہ مجازی حقیقت سنجیوں کی جانب پھر رجوع کیا جائے۔ دنیا میں شاعر و ادیب اب تک بیشمار پیدا ہو چکے ہیں لیکن قومیں اور امتیں زندہ لفظ تراشیوں اور لفظ پرستیوں سے نہیں معنویت کی روح سے رہتی ہیں اور ملیت کو غذا غزل سے نہیں ادب صالح از شریف لٹریچر سے ملتی ہے۔ سرسید کی دور رس نظر اس نکتہ پر تھی، اور یہی زندگی کا راز آپ کے لیے بھی ہے۔

---

۱۰ سیّد جالبؔ مرحوم

عمریں ختم ہوتے کیا دیر لگتی ہے! ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ جالبؔ صاحب سے اول اول ملاقات ہوئی تھی۔ پھر تعلقات بڑھے تھے۔ مشورے تھے، انجمنیں تھیں، لڑائیاں تھیں۔ ہمدم اپنے بام عروج پر پہنچا تھا۔ جالبؔ کی شخصیت کی اہمیت تھی: ہمدمؔ کا نام زبانوں پر اور جالبؔ صاحب کے تذکرے بزم و انجمن میں تھے کہ یک بیک مشیت کا رُخ پلٹا۔ جو زبان گویا تھی خاموش کردی گئی، جو شمع اجالا پھیلا رہی تھی بجھا دی گئی، جو افسانہ لکھا کرتا تھا خود افسانہ بن گیا۔ جو دوسروں کے نوحے سنایا کرتا اور ماتم نامہ چھاپا کرتا تھا، غفلت کے بندو! آؤ آج خود اس کے جنازہ کو کاندھا دیں اور ہوسکے تو اس کے لاشے پر دو حسرت کے دو ایک آنسو بہائیں! خلقت کس ذوق و شوق کے ساتھ داستان سننے میں محو تھی کہ لیجئے داستان گو صاحب خود ہی نیند کے خراٹے لینے لگے۔ رہے نام اللہ کا!

---

۱ روزنامہ حقیقت (لکھنؤ) ۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

غالباً ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے کہ سید جالب دہلوی کا نام اول بار کان میں پڑا تھا جب وہ پیسہ اخبار (لاہور) کے سلسلہ میں۔ اس کے دو تین برس کے بعد مکتوبات آزاد پر انھیں سید جالب کے قلم کا دیباچہ نظر پڑا۔ اس کے بعد دن اور تاریخ تو یاد نہیں، مگر خیال ایسا پڑتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کا موسم برسات تھا، جب دفتر ہمدرد کوچہ چیلان دہلی میں پہلی بار مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ ہمدرد اور کامریڈ دونوں اُس وقت اپنے شباب پر تھے۔ میں اپنی ایک ذاتی ضرورت سے مولانا محمد علی سے ملنے دہلی گیا تھا۔ ایڈیٹوریل آفس کے ایک کمرہ میں سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری سے باتیں کر رہا تھا کہ وہیں جالب صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ ہمدرد کے ایڈیٹوریل میں اس وقت فاروق صاحب اور قاضی عبدالغفار کے علاوہ خدا معلوم اور کون کون تھے اور انھیں میں ایک یہ جالب بھی تھے۔ چند ہی روز کے بعد سرکار کی برق غضب محمد علی پر گری ہمدرد بند اور مالک ہمدرد نظر بند ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی کا چارٹر سرکار کی من مانی شرائط پر مسلمانوں کے سر منڈھ دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں اس برات کے دولھا ہز ہائینس سر آغا خاں تھے۔ ۱۹۱۵ء میں یہ سہرا راجہ صاحب محمود آباد کے سر رہا۔ احرار کی مٹھی بھر جماعت آخر دم تک مخالفت پر قائم رہی۔ اس شوریدہ سر جماعت کے علمبرداروں میں ایک ہستی جالب صاحب کی بھی تھی۔ اس وقت سید جالب آف ہمدرد کا نام بار بار اخبارات میں آیا اور آتا رہا۔ اور جس زمانہ میں ہمدرد بند تھا اور مالک ہمدرد (مولانا محمد علی[۱]) چھندواڑہ میں نظر بند، ہمدرد مرحوم کی روایات آزادی کو بڑی حد تک جالب ہی کی شخصیت نے زندہ رکھا۔

ہمدرد اور زمیندار کے ختم ہو جانے کے بعد اردو پریس میں سناٹا تھا مسلمانوں کے

[۱] یعنی شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم صاحب آب حیات۔

ہاتھ میں کہنا چاہیے کہ کوئی روزانہ اخبار تھا ہی نہیں۔ گدیہ (ضلع بارہ بنکی اودھ) کے تعلقدار، لکھنؤ کے بیرسٹر اور صوبہ کونسل کے ممبر شیخ شاہد حسین قدوائی مرحوم کو اُردو روزنامہ نکالنے کی دھن سوار ہوئی۔ لکھنؤ کیا معنی سارے صوبہ متحدہ کے مسلمانوں کے لیے اُردو روزنامہ ایک نئی چیز تھی۔ یہ جولائی ۱۲ء کا ذکر ہے، ادارت کے لیے قرعۂ انتخاب جالبؔ پر پڑا اور یکم اکتوبر کو پہلا پرچہ خود جالب صاحب ہی کے الفاظ میں، جملہ محاسن و تابع نگاری و انشا پردازی کے ساتھ" عالم شہود میں آیا۔ ایک ہونہار نوجوان گریجویٹ جو اس وقت خود ایک روزنامہ کے مالک و مدیر ہیں[1]۔ اس وقت بیچارے تلاش معاش کی دشواریوں میں مبتلا تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جالب صاحب کی خدمت میں تعارف نامہ لکھ دیا۔ گئے اور خوش خوش آئے۔ ہمدم کے اسٹاف میں اسی وقت لے لیے گئے اور مجھ سے اور جالب صاحب سے واقعۃً اسی وقت سے تعلقات قائم ہو گئے۔ نمونہ کے ایک پرچہ کے بعد پہلا نمبر بڑے اشتیاق و انتظار کے بعد بڑی آب و تاب سے نکلا پہلے ہی نمبر میں ایک طویل مضمون خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر (اٹاوہ) کے جواب میں میرے قلم سے تھا۔ اور جالب صاحب کا پہلا مقالہ افتتاحیہ اسی مضمون کی تائید میں تھا — وہ دن اور اوادارت ہمدم کا آخری دن، شاید ہی ہمدم کے متعلق کوئی اہم مرحلہ ایسا پیش آیا ہو جس میں ہمدم کے مدیر شہیر مرحوم نے اپنے اس نیازمند کو شریک مشورہ نہ فرمایا ہو۔

ہمدم جب نکلا ہے تو اس سے طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں۔ شاہد حسین مرحوم کی ذات احرار ملت میں نہایت درجہ بدنام تھی۔ یورپ کی پہلی جنگ عظیم زور شور سے جاری تھی اور ٹرکی جرمنوں کی طرف سے شریک جنگ ہو چکے تھے۔ سرکار انگریزی کی نازک مزاجی

---

[1] یعنی انیس احمد عباسی بی۔ اے کاکوروی ایڈیٹر روزنامہ 'حقیقت' (لکھنؤ)

قدرۃ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آزادی کی ایک سانس لینا بھی دشوار۔ پھر جالب مرحوم لکھنؤ کے رہنے والے نہیں۔ مقامی حالات سے ناواقف اور جوار کی ہمدردیوں سے محروم۔ دہلی سے چلے آرہے تھے۔ کسی کو اُمید نہ تھی کہ پرچہ کچھ بھی کامیاب ہوسکے گا۔ خدا کی قدرت کہ پرچہ نکلتے ہی وہ رنگ جما کہ مایوسیاں دور، بدگمانیاں کافور۔ لکھنؤ میں ایک ایک کی زبان پر ہمدم تھا۔ ہمدم لکھنؤ کا ہمدم تھا اور لکھنؤ ہمدم کا ہمدم۔ اور لکھنؤ سے کہیں بڑھ کر صوبہ کے باہر، اودھ والوں کے حلقوں میں ہمدم کی مانگ تھی کلکتہ اور بمبئی دہلی اور حیدرآباد میں اودھ والوں کے پاس ہمدم پہونچتا تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اخبار آیا ہے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وطن سے کسی عزیز کا خط آیا ہے یہ تمت یہ جادو یہ دلکشی تمام تر "میر صاحب" کی شخصیت کا نتیجہ تھی۔ جالب صاحب محض ایڈیٹر ہی نہ تھے لکھنؤ کی سوسائٹی کا جزو بن گئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھنے پر اصرار تھا لیکن حقیقتاً اب وہ دہلوی سے زیادہ لکھنوی تھے شہر میں انجمن اردو کے جلسے ہوں یا مسلم اکاڈمی کی کمیٹیاں، قیصر باغ کی گارڈن پارٹیاں ہوں یا فرنگی محل کی دعوتیں، میلاد کی محفلیں ہوں یا محرم کی مجلسیں، ادبی مشاعرے ہوں یا سیاسی مظاہرے، نخاس کے کباڑخانہ ہوں یا امین آباد کی دکانیں، "میر صاحب" ہر جگہ ایسے گھلے ملے ہوئے تھے جیسے شربت کے گلاس میں شکر۔ جالب صاحب اب لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ ان کا تھا!

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۸ء تک بارہ تیرہ سال کی مدت میں ہمدم پر خدا معلوم کتنے دور گذرے، کتنے انقلابات آئے۔ "احرار" کا مقاطعہ، لاٹ صاحب کی ہتھکڑیاں بر دیر اکثر کا انتقال، ملکیت کی تبدیلی، شعبۂ ادارت پر احتساب، عام ملکی فضا کے شدید تغیرات مسلمانوں کے قومی مزاج کے اُتار چڑھاؤ، وقس علیٰ ہذا۔

مرحوم ہر تیر اپنے ہی سینہ پر روکتے رہے۔ ایک سے زائد بار عارضی علیحدگی کی بھی نوبت آئی پھر بھی مستقل تعلق کسی حالت میں نہ چھوٹا اور جب جب علیحدہ ہوئے اپنے ہمراہ ہمدم کی روح بھی لیتے گئے۔ اور اپنے پیچھے جسد بے روح چھوڑ گئے آخر میں جب مجبوراً مستقل طور پر علیحدہ ہونا پڑا تو اس کا ان کے قلب کو سخت صدمہ ہوا۔ کون باغبان ایسا ہے کہ زمین وہ تیار کرے، درخت وہ بٹھائے، پانی وہ دے اور جب پودے لہلہانے لگیں تو باغ سے نکال باہر کیا جانا ہنسی خوشی گوارا کرے!

پروپرائٹر کی طرف سے قدردانی کا یہ نرالا ثبوت اور اپنی جان توڑ خدمات کا یا نوکھا صلہ پاکران کا دل ٹوٹ گیا اور اس صدمہ دل شکستگی کا مستقل اثر ان کی صحت پر پڑا چند ہی روز کے بعد لکھنؤ سے اپنا ذاتی روزنامہ ہمت نکال کر گو انھوں نے اپنی حیرت انگیز بلند ہمتی کا نمونہ دکھایا لیکن جس بے سروسامانی کے عالم میں انھوں نے اتنی بڑی ہمت دکھائی اس کا حال کچھ ان کے مخلص احباب ہی جانتے ہیں۔ روزنامہ کے لیے جن تعداد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے چلانے کے لیے جو مستعدی اور قوت عمل ناگزیر ہے جب ایک طرف ان پر اور دوسری طرف مرحوم کی جیب اور رسن وسال پر نظر جاتی ہے تو بس ایک قدرت خدا نظر آتی ہے۔ اس کے پروپرائٹر ایڈیٹر، رپورٹر، کاتب، منیجر سب کچھ خود ہی تھے۔ ہمت کی خدمات ابھی سب کے سامنے ہیں۔ اس کی خامیاں جو کچھ بھی ہوں حیرت اس پر ہے کہ اتنی خوبیوں کے ساتھ سوا برس سے پرچہ زندہ کیوں کر ہے[1]

مرحوم کی درسی و باضابطہ قابلیت کسی علم و فن میں کچھ زائد نہ تھی لیکن کتب بینی کے ذوق و شوق اور مطالعہ کی وسعت و ہمہ گیری نے ان کو خاصا عالم بنا دیا تھا۔

[1] افسوس ہے کہ اس کے کچھ ہی دن بعد ہمت بھی بند ہو گیا۔

کتاب کے کیڑے تھے۔ جس علم و فن کی جو کتاب جہاں کہیں اور جس طرح بھی ہاتھ لگ جاتی کوشش یہی کرتے کہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیں پرانے رسالوں کے عاشق تھے، دن کو موقع کہاں مل پاتا، پیرانہ سالی اور بینائی کی کمزوری کے باوجود رات میں پڑھا کرتے تھے۔ اُردو تو خیر مادری زبان تھی ہی، پھر دہلی کی پیدائش، اہل زبان کے درمیان نشو ونما، مولانا حالی مرحوم سے ابتدائی صحبتیں۔ داغ کی شاگردی بیسب مستزاد۔ فارسی اور انگریزی کی استعداد اچھی خاصی تھی۔ جو چیز ایک مرتبہ دماغ کے اندر پہنچ گئی بس پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اِس دور میں ایسا قوی حافظہ مسلمانوں میں تو بعد مولانا محمد علیؒ اور دیوبند کے مولانا انور شاہ کشمیری کے انھیں کا دیکھنے میں آیا۔ دماغ کیا تھا متفرق معلومات کا ایک حیرت انگیز خزانہ تھا۔ جو چیز بس ایک بار پڑ گئی نکلنا گویا جانتی ہی نہ تھی۔ کوئی سا بھی موضوع مشکل سے ایسا ہو گا جس کے متعلق انھیں واقفیت نہ ہو۔ لیکن مخصوص ذوق کی چیزیں ادب اور تاریخ تھیں۔ تاریخ میں بھی تاریخ ہند پر گہری نظر رکھتے تھے۔ روزانہ اخبار کی مصروفیتیں اتنا موقع ہی کب دیتی تھیں ورنہ تاریخ سے متعلق مرحوم متعدد یادگاریں یقیناً چھوڑ جاتے۔ پھر بھی اپنی وفات سے سال دو سال قبل پانی پت کے آخری معرکہ خونیں پر جو مبسوط مقالہ سپرد قلم فرما گئے ہیں وہ اب بھی اہل نظر کے لیے قابل ملاحظہ ہو۔

مرحوم کی وسعت معلومات وقت کے اکثر ایڈیٹروں کے لیے باعث رشک تھی تقریباً ہر مسئلہ پر وہ تیار اور پوری طرح تیار رہتے تھے۔ خدا معلوم کتنے اہل قلم اور اہل سیاست آآ کر اس خرمن سے خوشہ چینی کرتے اور اس ایک چراغ سے خدا معلوم کتنے چراغ جلتے تھے لیکن ان کمالات کے باوجود جالب صاحب موجودہ جرنلزم کے اہل نہ تھے۔ نہایت بامروت اور بڑے وضعدار تھے۔ سخت کلامی اور دشنام نگاری

جانتے تھے۔ دھکا دھکا کر ادر ڈراڈراکر تفصیل زر کے فن سے بیگانۂ محض تھے مزاج میں سادگی تھی، تکلفات سے بری تھے۔طبیعت کے بھولے تھے۔بزرگوں کا ادب و لحاظ اور چھوٹوں کے لیے شفقت و محبت دل میں رکھتے تھے۔جن کے دوست ہوتے حاضر و غائب یکساں اس کے ہوا خواہ رہتے۔بڑے ہو کر چھوٹوں کا مشورہ قبول کر لینا گناہ نہیں سمجھتے تھے۔مشرقی معاشرت اور اسلامی آداب کے دلدادہ تھے بیسویں صدی کی "چلت پھرت" اور روشن خیالیوں سے عاری تھے۔غرض فن صحافت جدید کے جو جوہر سمجھے جاتے ہیں۔ان سب سے نطعاً دیکسر کورے تھے۔
انسان کی سیرت کا اصلی جلوہ حالت موافقت میں نہیں، مخالفت کے وقت نظر آتا ہے۔۲۵ء کی آخری سہ ماہی میں نجد و حجاز کے مسئلہ میں راقم سطور سے اور جالب صاحب سے شدید اختلاف رہا۔لکھنؤ بلکہ ملک کا سارا اسلامی پریس اس وقت قریب قریب بالکل ہی مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔اس وقت بڑے بڑے پرانے ملنے والوں اور دوستوں کے خوب خوب تجربے ہوئے۔جالب صاحب اپنے رنگ میں سب سے سے تنہا ثابت ہوئے۔شدید اختلاف مسالک کے باوجود کسی ایک موقع پر بھی تہذیب و متانت کے حدود سے باہر نہ ہوئے۔اور نہ ذاتی تعلقات میں کوئی فرق آنے دیا۔اپنی شرافت و وضعداری کو بڑی حد تک اپنے ہمراہ ہی لے گئے اخبار نویسی میں اپنے شاگرد شاید بیسیوں کی تعداد میں چھوڑ رہے ہیں ۱۰، ۱۲ کا تو مجھی کو علم ہے۔ان میں سے بعض "سعادت مندوں" نے خوب خوب چرکے دیئے لیکن مرحوم کا اخلاق ہر ایک کے ساتھ بدستور قائم رہا حسن سلوک و مدارات میں کسی کے ساتھ فرق نہ آنے دیا۔

دنیا کی منزلیں ختم ہو گئیں۔آخرت کی منزلیں شروع ہو چکیں۔خلق سے سابقہ ختم ہو چکا خالق سے سابقہ شروع ہو گیا ارحم الراحمین اپنی امداد و توفیق سے بیڑا

پار لگائے ۔ جگ بیتی کے چھاپنے میں عمر صرف کردی ۔ اس وقت آپ بیتی کے دفتر کھلے ہوں گے ۔ سوال یہ نہیں ہو رہا ہو گا کہ جین نے کیا کیا اور روس میں کیا ہوا سوال اپنے ہی ذات کے متعلق ہو رہے ہوں گے اور جواب اس کے مانگے جا رہے ہوں گے کہ خود کیا کیا ۔ اور خالق و مخلوق کے حقوق کہاں تک ادا کئے ۔ یہ وقت سب کو پیش آنا ہے اور سب کے یاد رکھنے کا ہے ۔ آج جو بڑھ بڑھ کر اور اپنی ذمہ داری کو بھلا بھلا کر دوسروں پر رائے زنی کر رہے ہیں اور ساری دنیا جہان کے مقدمات کا فیصلہ اپنے قلم سے کر رہے ہیں اس وقت کو نہ بھولیں جو عنقریب آنے والا ہے اور جب خود ان کا مقدمہ حاکم اعلیٰ کی عدالت میں پیش ہو گا ۔ جب خود ان کے خلاف گواہیاں گذریں گی اور جب خود ان پر جرح اور بحث قائم ہو گی ۔ اللہ ہر مومن کی یاوری اس نازک وقت میں کرے ۔ جالب مرحوم صاحب ایمان تھے عقائد کے پختہ تھے ۔ مسلمان تھے مسلمانوں کے رب کے پرستار تھے ۔ مسلمانوں کے رسول کی شفاعت کا آسرا لگائے ہوئے تھے ۔ رب آمرزگار و خدائے غفار انہیں اپنی رحمت و مغفرت کی بارشوں سے سیراب کرے ۔ اور جنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات ان کے نصیب میں لائے ۔

٢

چند نثریئے

(۱)

ہماری زندگی اور اُس کے رنگ ڈھنگ[۱]

ہوٹل سے بھلا پرہیز تھیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

نگاہوں سے دور اور آنکھوں کی پتلیوں سے مستور لیکن دل کی آنکھوں کے پاس اور جسمِ تصور کے لیے بمنزلۂ لباس، سننے والے بھائیو! اور سننے والی بہنو! زمانہ کی نیرنگی اور کارخانۂ دہر کی عجائب کاری کہ "سوسائٹی" کے مضمون پر بولنے وہ کھڑا کیا گیا ہے جو شہر چھوڑ، خود ایک ویرانہ میں پڑا ہے اور آپس کے میل جول کی زندگی پر زبان کھولنے وہ اُٹھا ہے جو خود سب سے الگ تھلگ گوشہ نشینی کی کملی سے چھپا ہوا ہے! زندگی کا نام کا نور! اناڑی کے ہاتھ میں بندوق! ریڈیو کے عجائب زار میں

---

[۱] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۹ راکتوبر ۱۹۳۸ء کو نشر ہوئی۔

ایک اور تجربہ کا اضافہ! فطرت ٹھیٹھ مشرقی، تعلیم ملی تو کچھ مغربی سی۔ آنکھ کھلی مشرق کے صحن و دالان میں، عقل و خرد نے ہوش سنبھالے مغرب کے پارک اور میدان میں۔ جوانی آخر دیوانی، یہ دیوانگی ہمیشہ شعر و شاعری کے سایہ میں نہیں پلتی اور افسانہ اور رومان ہی کی سرزمین پر نہیں جڑ پکڑتی، کبھی شدتِ فرزانگی کے روپ میں بھی جلوہ دکھا جاتی ہے، دل طلسمِ فرنگ کا مفتوں اور دماغ لیلائے مغرب کا مجنوں! مدتوں تل اور اسپنسر اور ہکسلے سر پر سوار رہے اور برسوں آنکھ لڑی رہی اسپنوزا (عقلیت) سے اور رائیگن اسٹی ازم (لاادریت) سے نشہ آخر اترا اور تب چھوٹا ہوا گھر یاد آیا۔

گھر! ہاں وہی مشرقی گھر ندا۔ ہاں وہی مشرق، جہاں ہر صبح مسجدوں میں وضو ہوتے ہیں اور دریاؤں میں اشنان، جہاں ہر شام مسجدوں میں اذانیں اور مندروں میں گھنٹے بجتے ہیں، جہاں صبح، آفتاب نکلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے اور جہاں شام، دن چھپنے کے ساتھ ہی آ جاتی ہے جہاں یہ نہیں ہوتا کہ سائنس کا کمال، رات کو دن بنا دے اور آرٹ کی جنت نگاہ دن میں رات کے سب مزے بھر دے! یہ وہ زمین ہے جس پر کبھی آسمان کو بھی ناز رہ چکا ہے! تبھی اولیاء اور بڑے بڑے رشی اور گیانی کسی زمانہ میں اسی زمین پر چلے پھرے، رہے بسے ہیں۔ اور آج بھی اپنے طریق پر خدا جانے کتنے ذکر و فکر کے حلقوں کو بسائے اور گیان دھیان کی سمادھیوں کو رچائے ہوئے ہیں! یہ وہ خطہ ہے جہاں اب تک عزت ہو رہی ہے برقع اور گھونگھٹ کی، نقاب اور چادر کی، جہاں اب تک شوہر کو سرتاج اور سوامی کہا جاتا، اور باپ کو قبلہ و کعبہ لکھا جاتا ہے! یہاں والوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے اور ماں کو ادب کے ساتھ سلام کرنا، اس کے قدموں سے آنکھیں ملنا دستور میں داخل ہے

اولاد کا سلسلہ پیدائش روکنے کی جگہ یہاں اب تک بیٹا "لختِ جگر" اور بیٹی "نورِ نظر"
ہے! غیرت یہاں اب تک سب سے بڑھ کر ماں کی اور بہن کی اور بیٹی کی، دلوں
میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ان کی بے حرمتی کی طرف اشارہ، شریفوں کو چھوڑ دیئے،
بازاریوں اور آوارہ مزاجوں کی زبان میں بھی سب سے بڑی گالی ہے! ادب اب
تک یہاں بڑوں کا چلا آتا ہے۔ محلہ کا "ادنیٰ" اگر سن میں بڑا ہے تو "اعلیٰ" سے
اُستاد اور گرو کا حق مانا جاتا ہے استادوں کے خلاف اسٹرائکوں (ہڑتالوں)
کی جگہ اُلٹے ان کے حق زندہ دو پشتوں تک مانے جاتے ہیں! خاندان کے معنی محض
میاں بیوی کے جوڑے کے نہیں لیے جاتے۔ ماں اور باپ کے علاوہ چچا اور ماموں
اور پھوپھی اور خالہ اور بھاوج اور سالی اور سالے اور بہنوئی اور وہ بھی صرف سگے
نہیں، رشتے کے، بیگانے نہیں، اپنے اور خاندان سے خارج نہیں، خاندان
کا جز سمجھے جاتے ہیں! یہاں بیسویں صدی میں بھی تعلقات آٹھویں صدی اور
ساتویں اور چھٹی صدی اور اس سے بہت پہلے کی صدیوں سے ٹوٹے نہیں قائم ہیں،
یہاں اب تک صبح اُٹھ کر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے اور گیتا کے اشلوک پڑھے
جاتے ہیں۔ یہاں والوں کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ مذہب کی بنیادی حقیقتیں اور
اخلاق کی ٹھوس سچائیاں بھی ایک طرح لباس کے فیشن کے حکم میں داخل ہیں کہ صبح
کو کچھ ہیں اور شام کو کچھ اور ان کے دلوں پر اب تک حکومت گیتا کی اور راماین کی،
اور سعدیؒ کی اور مولانائے رومؒ کی چلی آ رہی ہے۔ یہاں والے آج تک اپنے
مذہبی پیشواؤں کی ہدایتوں کو سورج کی روشنی کی طرح مستقل اور پائدار، سال
کے تین سو پینسٹھ دن قائم مانتے ہیں اور بزرگوں کے نام پر مجلسیں محفلیں کرتے اور اپنی
اپنی سمجھ کے لائق اُن کی یادگاریں مناتے چلے آتے ہیں۔ یہاں اب بھی انکسار فروتنی
اور عاجزی کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں شریف اُسے سمجھا جاتا ہے جو زندگی

کی دوڑ میں دوسروں کو ڈھکیل کر، گرا کر، اپنا راستہ صاف کرنے کی بجائے اپنے کو پیچھے رکھتا ہے، خود ہٹتا جاتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ اپنے کارناموں کو مشتہر کرنے اور اپنے کمالات کا "میمنی نسخہ" شائع کرنے کے فن میں بھی ابھی وہ بالکل نوآموز بلکہ اناڑی ہے۔ اس کے ہاں اپنے لیے دستور اس قسم کے الفاظ کے استعمال کرنے کا ہے، "حقیر" "پُرتقصیر" "کمترین" "مسکین" "خاکسار" "ذرہ بیمقدار" "خادم" "آثم" اور جب کوئی اُسے آگے بڑھانا چاہتا ہے تو جواب اس قسم کا سننے میں آتا ہے "یہ محض آپ کا کرم ہے" "حسنِ ظن ہے" "بندہ نوازی ہے، عزت افزائی ہے" "یہ خاکسار ہے کس قابل"۔ یہاں کے باشندے اپنی سادہ دلی سے اب تک مہمان نوازی کو بڑی صفت سمجھے ہوئے ہیں۔ اور گھر کو ہوٹل بنا دینے اور مہمانوں کے آگے بل پیش کر دینے کے فن میں بالکل کورے ہیں۔ اُن کے وسیع چوپال، اُن کے کشادہ چبوترے، اُن کے فراخ صحن، ہر وقت آنے جانے والوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ ڈرائنگ روم اور وزیٹنگ کارڈ کی رسم اور ان کے باہمی تعلق کی خبر سے اُن کے کان ناآشنا ہیں۔ ان کے کچے گھروں کی بڑی رونق ہے اُن کی صفائی اور ستھرائی، اور اصلی زینت ہے ان کی لپائی اور پتائی۔ بیش قیمت کوچ اور صوفے اب تک ان کی نظروں میں کچھ زیادہ جچتے نہیں ہیں۔ زمین کے تدرتی سادہ فرش پر بڑا تکلف و اہتمام کیا تو گدّے اور قالین اور سفید چاندنی کا اُجلا اُجلا فرش اُنکے لیے کافی سے زائد ہے۔

چائے اور کافی کی چاٹ اب تک ان میں سے بہتوں کو نہیں پڑی ہے گھروں میں پلی ہوئی گائیں اور بھینسیں اور یہ اُنھیں کے دودھ، دہی، مکھن اور گھی میں مگن۔ سگار اور سگرٹ کے فوائد اب تک ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ پان کی گلوریاں، مسالہ، الائچیاں یہی ان کے لیے تکلفات! اُن کی تفریح کی جگہیں

خود اُن کے گھروں کے اندر انگنائیاں اور دالان، پائیں باغ اور چمن۔ بیوی بچوں میں، گھر گھرانے کے دوسرے لڑکوں لڑکیوں میں دل ایسا بہلا رہتا ہے کہ تھیٹر، کارنیوال، سینما اور نائٹ کلب میں راتیں گزارنے کا دھیان بھی نہیں آتا! یہ صبح سویرے جب آنکھ کھولتے ہیں تو خدا کا نام لیتے ہوئے اور رات کو جب سوتے اور لیٹتے ہیں تو اپنے تئیں خدا کو سونپتے ہوئے۔ یہاں کی چڑیاں تک جب چہچہاتی ہیں، تو یہ بول اُٹھتے ہیں کہ وہ دیکھو خدا کا نام جپ رہی ہیں۔ کوئل کی کوک میں، مرغ کی بانگ میں، پپیہے کی پکار میں، قمری کے زمزمے میں، بلبل کے نغمے میں مور کے شور میں، سب میں اُنھیں پروردگار کے نام کی تسبیح ہی سنائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں کماتا ایک ہے تو کھاتے دس بیس ہیں۔ لڑکے بالے بھائی بہن، ماں باپ، خون کے رشتہ دار اور دودھ کے رشتہ دار، اپنے عزیز اور پھر اُن عزیزوں کے عزیز۔ ایک کی کمائی میں خدا جانے کتنے شریک، خود غرضی کا یہ فلسفہ ابھی یہاں تک نہیں پہونچا ہے کہ محلہ کے بوڑھوں اور اپاہجوں، بڑ دس کے لنگڑے، لولے، اور اندھوں اور بستی کے یتیموں اور رانڈوں کا حق ہی کسی کمانے والے کی کمائی میں کیا ہے؟ باضابطہ "محتاج خانے" اسی لیے اس سرزمین پر بہت کم نظر آتے ہیں کوئی بیمار پڑتا ہے تو گھر والے اُس سے وحشت اور دہشت کھا کر بھاگتے نہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ گھر کی مالکہ، گھر کے مالک کو نرسوں کے حوالہ کر، خود شام کی ٹینس یا شام کی تفریح کے لیے تشریف لے جائیں۔ مریض کی خدمت اور تیمارداری پہ گھر بھر ٹوٹ پڑتا ہے اور اسے بیمار پر کوئی احسان نہیں، خود اپنے لیے باعث سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اور گھر والوں میں کوئی اس قابل نہ ہوا تو محلہ والے ہجوم کر کے آگھتے ہیں، اتنے رضا کاروں (والنٹیروں) کے ہوتے ہوئے باضابطہ ٹرینڈ نرسوں کی فوج کی فوج قدرۃً یہاں تیار نہیں ملتی۔

ان کے ہاں بچہ جب تعلیم کو بٹھایا جاتا ہے تو سب سے پہلا سبق خدا کے نام ہی کا ملتا ہے۔ یہاں تک کہ "بسم اللہ" کرانا ان کی بولی میں ہم معنی قرار پاگیا ہے ہر امر کی ابتدا کرنے کا۔ یہاں کی کانگریسیں، کانفرنسیں، جب پر جوش جلسے کرتی ہیں تو دھواں دھار تقریریں اور گرما گرم بحثیں تو بعد کو ہوتی ہیں، پہل ہوتی ہے کسی نہ کسی صورت میں خدا ہی کی حمد و ثنا سے۔ یہاں کے اہل قلم جب تصنیف کرنے بیٹھتے ہیں تو پہلی سطر ہوتی ہے حمد الٰہی کی۔ ان کے ہاں جو قصے کہانیاں رائج ہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی درس اخلاق کا، معرفت الٰہی کا خواہ مخواہ ہوتا ہے "ادب، ادب کی غرض سے" "فن، فن کی خاطر" "آرٹ، آرٹ ہی کے لیے" اس اونچے، بہت اونچے فلسفہ تک ان بیچاروں کے دماغ کی رسائی ابھی نہیں ہو پائی ہے۔ الکشن کے فن جدید میں بھی یہاں والے ابھی بہت پیچھے ہیں۔ حریف کو نیچا دکھانے کے داؤں گھات ابھی ان کی عقل کی گرفت میں پوری طرح نہیں آئے ہیں۔ اس لیے جب انھیں خود بحیثیت امیدوار اپنا فخریہ بیش کرنا ہوتا ہے تو کچھ جھکرا سے جاتے ہیں اور جب بڑھتے ہیں تو ٹھوکر قدم قدم پر کھاتے ہیں۔ مروت ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ غریب کیا جانیں کہ وقت پر کام نکال لینے کا فن کیا ہوتا ہے۔ ان کی مسجدیں، ان کی خانقاہیں، یہاں تک کہ ان کے میلے، ٹھیلے، لوگوں کو اکٹھا کرنے والے، جمع کرنے والے، مرکز وحدت کی طرف لانے والے ہوتے ہیں۔ انھیں کیا خبر کہ سیاسی بڑائی اس میں ہے کہ آپس میں خوب لڑا جائے اور پارٹی در پارٹی بنتی چلی جائے ان کے ہاں عورت کے لیے نظریں نیچی رکھنا اور جسم کو ڈھکے رکھنا اب تک شرافت کا نشان اور عصمت کی پہچان ہے یہاں تک کہ ان میں جو بدنصیبیں بالکل بازاری ہو جاتی ہیں، وہ بھی دنیا کا شرم و لحاظ رکھتی ہیں۔ اور عام مجلسوں میں بے باک نہیں ہوتیں یہ ترقی علوم ان کی سمجھ میں اب تک نہیں آئے ہیں کہ اگر کالج کے ایک ہی کلاس میں

نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں زانو بہ زانو بیٹھ کر پڑھیں گی تو ان کا دماغ زیادہ روشن ہو جائے گا یا ان کی عقل کو زیادہ جلا ہو جائے گی، یا عورتیں اگر اپنے جسم کا بڑا حصہ قید لباس سے آزاد کیے بازاروں میں، اسٹیشنوں پر، سینما گھروں میں بکھری ہوں گی۔ تو اس سے اُن کے اخلاق بلند ہو جائیں گے! ابھی تک یہاں کی عورتیں اپنا مقصد زندگی صرف خدمت سمجھ رہی ہیں۔ خدمت ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی، شوہر کی، اولاد کی اور خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں وہ سہاگنیں جو خدمت کرتی ہوئی شوہر کے ہاتھوں اُٹھ جاتی ہیں۔ یہاں کے اخبارات عدالت طلاق کی کارروائیوں سے لبریز نہیں ہوتے۔ یہاں کی لڑکی جب بیاہ کے بعد اپنا گھر چھوڑ کر سسرال جاتی ہے تو ساس کی شکل میں اُسے دوسری ماں اور سسرے کی شکل میں اُسے دوسرا باپ میسر آ جاتا ہے۔ اور اس طرح ان دونوں کو بہو کے قالب میں ایک اور بیٹی مل جاتی ہے۔

یہاں کے نظام کی بنیاد کشمکش (STRUGGLE) پر نہیں، معاونت و مددگاری (ALLIANCE) پر ہے۔ قناعت اور زہد و تقویٰ کا اب تک ان کے ہاں بڑا درجہ ہے۔ خان بہادری اور رائے بہادری اور نائٹ ہڈ تو ان کے بس کی چیز نہیں۔ اسے چھوڑیئے۔ باقی یہاں کی زبان خلق مقدس انھیں کو ٹھہراتی ہے جو بڑے بڑے بنکوں کے ڈائرکٹر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئر ہولڈر نہیں، بلکہ جو دنیا سے منہ موڑے، اور ہوس دنیوی کو چھوڑے ہوتے ہیں۔ عقیدت کے پھول انھیں آستانوں پر چڑھتے ہیں جو فقر و مسکنت کے تاجدار ہوتے ہیں۔

اعتقاد دواؤں سے بڑھ کر دعاؤں پر رہتا ہے اور بھروسہ تدبیر سے کہیں زیادہ تقدیر پر۔ بلاؤں کے، وباؤں کے دور کرنے کے لیے یہ محض ڈاکٹروں، حکیموں کے سہارے پہ نہیں رہتے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کرتے ہیں، روزوں کی منت

مانتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں، خیرات کرتے ہیں ـــــــ یہ ہے ہماری یعنی ہم مشرقیوں کی سوسائٹی کا دُھندلا ساخاکہ اور پرانی دنیا والوں کی مجلسی زندگی کا مختصر سا نقشہ لیکن قریب ہے کہ حال ماضی ہو کر رہے۔ حضرت اکبرالہ آبادی کا جو شعر شروع گفتگو میں عرض ہوا تھا۔ ایک بار حافظہ میں پھر تازہ کرلیا جائے ؎

ہوٹل سے بھلا پرہیز کہیں، اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

پنڈت جی مہراج اپنی بات پر جمے رہنے والے، اپنی آن پر اڑے رہنے والے عین کنسرویٹوازم کی تصویر تھے۔ جب وہی اپنی جگہ سے اتنا سرک گئے تو مہ شما کا ذکر ہی کیا، مشرق کو انقلاب کے ہنگامے مغرب سے گڈ مڈ کر رہے ہیں۔ اور پرانی دنیا کو نئی دنیا میں تبدیل ہونے کے لیے صدیوں کیا معنی برسوں کی بھی مدت درکار نہیں۔ مہینوں بلکہ ہفتوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہو ؎

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بدھوا کڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

او دھ اور رنگ دھ دیش، اجودھیا اور پاٹلی پتر مدت ہوئی افسانہ بن چکے۔ بلگرام اور خیر آباد۔ بارہہ اور عظیم آباد کی دل و دماغ پر حکومتیں مدت ہوئی ختم ہو چکیں، لکھنؤ کی لکھنویت ایک ٹمٹماتا سا چراغ، دہلی کی دہلویت ایک شمع بلا فانوس، لندن اور پیرس اور نیو یارک کی ہواؤں کے جھونکے اسے ہر لحظہ بجھا دینے کو تیار اور اب سب سے بڑھ کر ماسکو کی آندھی کے جھکڑ ؎

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے ساماں بہم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں

زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ وحشم ہوں گے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

ریڈیو والوں کا یہ احسان کچھ کم ہے کہ جو تہذیب عنقریب مٹنے والی اور جو زندگی دیکھتے دیکھتے ختم ہونے والی ہے اُس کی ایک ہلکی سی جھلک آئندہ زمانہ میں آثار قدیمہ کا کھوج لگانے والوں کے لیے محفوظ کرادی!

---

(۲)

سائنس پر مکالمہ[1]

میر صاحب۔ آداب بجالاتا ہوں، سرکار۔ مزاج شریف۔
شیخ صاحب۔ آہا۔ جناب میر صاحب قبلہ ہیں تسلیم۔ تشریف لایئے۔ یہ آج چاند کدھر سے نکل آیا۔ اچھا اب سمجھا۔ مرزا صاحب ساتھ ہیں، یہی گھسیٹ لائے ہوں گے۔
مرزا صاحب! جی اور کیا۔ یہ بھلا اب ریڈیو چھوڑ کر کسی سے ملتے ملاتے ہیں۔ وہ تو کہئے میں گرفتار کر لایا۔ آپ کو ان کے شوق کا حال معلوم ہے نہ شیخ صاحب؟
میر صاحب۔ خیر یہ تو مرزا صاحب کی شاعری ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب سے ریڈیو لے لیا ہے۔ باہر نکلنا ذرا کم سا ہو گیا ہے۔ ظالم میں کچھ ایسی لذت ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور کمبخت چیز بھی تو ایسی ہی ہے۔ جو بیسوں گھنٹوں کا مصاحب۔ دن بھر چاہے باتیں سنا کیجئے۔ دل بہلایا کیجئے، نہ لڑائی جھگڑے کا ڈر، نہ کسی کی حکایت نہ شکایت۔ میں کہتا ہوں شیخ صاحب ان ولایت والوں کو سوجھتی بھی کیا کیا ہے۔ کیسی کیسی چیزیں

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۰ء کو نشر ہوا۔

ایجاد کردی ہیں۔ ان کا سائنس ہے کہ جادو۔ کوئی حد ہے ان کی عقل کی رسائی کی۔
شیخ صاحب۔ جادو آپ کی عقل پر تو ضرور چل گیا ہے۔ مرد آدمی عقل نام ہے قوت فکری کا۔ ان مشینی ایجادوں سے قوت فکری کی کونسی کرامت ثابت ہو گئی؟ بس وہی جیسے ہمارے ہاں بڑھئی، لوہار، مستری، کاریگر ہوئے ہیں، ویسے ان کا ہاں انجینئر، مکینک، ٹکنیشین۔ تجربہ ان کا بڑھا ہوا۔ بہت بڑھا ہوا سہی۔
میر صاحب۔ حد کر دی آپ نے بھی شیخ صاحب۔ یہ کوئی کمال ہی آپ کے نزدیک نہ ہوا کہ آدمی گھر بیٹھے سیکڑوں، ہزاروں میل کی خبریں دم بھر میں سن لے۔ لندن کا آدمی گویا دیوار کے پیچھے کھڑا ہوا اور اب تو بولنے والے کی تصویر بھی آجایا کرے گی اور پھر خرچ ہی کیا دو چار سو میں اچھا سا سٹ لے لیجئے۔ دیہات میں بیٹری لگا کر سنئے۔ سفر میں ساتھ رکھئے۔
شیخ صاحب۔ جی ہاں اور یہ کمال کچھ کم ہے کہ گھر بیٹھے جن بائی صاحبہ کا چاہے پتہ لگا لیجئے۔ نہ بدنامی کا ڈر نہ گلیوں میں خاک چھاننے کی ضرورت۔
میر صاحب۔ لاحول ولاقوۃ۔ آپ کی نظر بھی سب چھوڑ چھاڑ کر کہاں جا کر پڑی! میں کہتا ہوں کہ اول تو موسیقی کی سر پرستی میں عیب ہی کیا ہے۔ زندہ قومیں زندہ اسی کے دم سے ہیں اور پھر مانا کہ ایک عیب آپ نے ٹٹول لیا۔ تو ہنر بھی تو اس کے مقابلہ پر دیکھئے۔
شیخ صاحب۔ وہی تو جاننا چاہتا ہوں۔ یہ مشین پر مشین جو دن پر دن ڈھلتی جاتی ہے آخر اس سے فائدہ کیا ہے جو دنیا کو پہونچ رہا ہے؟
مرزا صاحب۔ میرے خیال میں یہ طے کر لیجئے کہ نفع یا فائدہ کسے کہتے ہیں؟
میر صاحب۔ میں تو فائدہ سے مراد یہ لیتا ہوں کہ انسان کو زندگی میں راحت ملے، سکھ نصیب ہو۔
شیخ صاحب۔ اور دکھ دور ہو۔ ورنہ ایک راحت اگر دس مصیبتیں اپنے ساتھ لگا لائی بھی تو یہ بھی کوئی علاج ہوا؟ الٹا اور دبال ہو گیا۔

میر صاحب ۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے ۔ آگے چلئے ۔

شیخ صاحب ۔ تو بس اپنے ہی قائم کئے ہوئے معیار پر ان نت نئی کوششوں کو جانچ لیجئے ۔ ریل کا نام آپ پیش کریں گے ؟ اچھا اسی کو لیجئے یہ فرمایئے کہ غلہ کی مستقل گرانی جواب ہو گئی ہے کبھی ریل کے دور سے پہلے بھی تھی ؟

میر صاحب ۔ سبحان اللہ ! ریل کا اس میں کیا قصور ۔ ریل قحط زدہ علاقوں میں غلہ پہنچا کر مصیبت ہلکی کر دیتی ہے ۔

شیخ صاحب ! جی کیسی کچھ ۔ ادھر غلہ کھیتوں سے کٹ کر آیا نہیں کہ ادھر مال گاڑیوں میں بھر بھر باہر چلا نہیں اور پھر ملک کے اندر الٹ پلٹ کر رہتا ، جب بھی غنیمت تھا ۔ یہ تو خدا معلوم کہاں سے کہاں پہو پنچ جاتا ہے ۔ ایسے میں گرانی نہ ہو تو اور کیا ہو ؟

میر صاحب ۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ مسوری اور نینی تال اور شملہ آنا جانا پہنچانا ریل ہی کا کام ہے ۔ ریل نہ ہوتی تو ہم ترسا ہی کرتے اور ان صحت بخش مقاموں کی ہوا بھی نہ لگنے پاتی ۔

شیخ صاحب ۔ اور ریل خود جو بیماریوں کا گھر ہے ؟ یہ انجن کا بھبکہ کا آیا ہوا دھواں آپ کے خیال میں بالا بالا چلا جاتا ہے ؟ سانس پر پھیپھڑوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ؟ میرے بھائی نزلہ اس سے پیدا ہو جائے گلے میں خراش اس سے ہو جائے ، کھانسی اس سے آنے لگے ، دق اور سل کی بنیاد پیدا کر دے یہ دھواں کوئی ایسی ویسی چیز ہے ۔ کسی بڑے جنکشن پر ذرا کچھ دیر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھئے تو بادل کے بادل دھوئیں کے چھائے ہوئے ۔ جمے ہوئے ، کپڑے الگ غارت ہاتھ منہ الگ کالک میں لت پت ۔ اور کوئلہ کے ذرّے ہیں کہ گھسے جا رہے ہیں ، آنکھ میں ، کان میں ، ناک میں ؛

انجن والے بیچاروں کی تو وہ گت بن کر رہتی ہے کہ سبحان اللہ۔ اللہ نہ کرے دشمن کا بھی یوں منہ کالا ہو!

میر صاحب۔ اب اپنی ہی کہے جائیے گا، یا دوسرے کی بھی سنیے گا؟

شیخ صاحب۔ بات ابھی کہاں ختم ہوئی جو دم لوں۔ اپنی کالی کلوٹی کے گن ابھی آپ نے پورے سنے کہاں؟ اپنے کسی لمبے سفر کو یاد کر لیجئے، مسلسل جھٹکے اور دھچکے اور کر توڑ ہچکولے۔ انسان کو پیس کر چور چور کر کے، اعصاب چاہے فولاد کے بنے ہوں جب بھی انھیں دھول سا کر رکھ دیں۔ پھر رات کے سناٹے میں کوس کوس دو دو کوس کے فاصلے سے سن لیجئے کہ انجن گھڑ گھڑاتا ہوا دھڑ دھڑاتا ہوا زمین کا سینہ چیرتا ہوا چلا آرہا ہے جیسے جنگل کا کوئی دیو چنگھاڑتا پھنکارتا ہوا آرہا ہے۔ یہ آج جو اتنی کثرت سے عصبی اور خفقانی بیماریاں نکل پڑی ہیں، ان میں کوئی ہاتھ ریلوے بازی کا نہیں؟ ذرا کسی بڑے محقق ڈاکٹر سے تو پوچھ دیکھئے۔

میر صاحب۔ غرض یہ کہ دنیا جہان کی ساری خرابیاں ریل میں آکر جمع ہو گئی ہیں!

شیخ صاحب۔ ابھی کیا ہے۔ سنتے جائیے۔ ہیضہ اور طاعون اور چیچک اور خدا جانے اور کون کون، آپ ہی کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کتنی بیماریاں ہوتی ہیں یہ ملک الموت کی دبائیں کہ ابھی کلکتہ میں تھیں۔ ابھی بمبئی پہونچ گئیں، ابھی لکھنؤ میں نمودار ہوئیں ابھی پشاور میں جا نکلیں۔ یہ سب آپ کے ریلوے کی برکت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر یہ تو ہوئیں جسمانی بیماریاں۔ باقی جہاں جہاں پہلے پہل آپ کی سواری باد بہاری پہونچی ہے وہاں اس کے جلو میں شراب خواری ناچ گھر اور کیا کیا نہیں پہونچا؟ کچھ اس کی بھی خبر ہے؟

میر صاحب۔ اور فائدہ ان ساری برائیوں کے مقابلہ میں آپ کو ایک بھی نظر نہ آیا۔

شیخ صاحب ۔ ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ پیروں کی قوت دن پر دن جواب ہی دیتی چلی گئی ۔ باپ دادا تیس تیس چالیس چالیس میل کی منزل پیدل مارنے والے ۔ صاحبزادوں کے سامنے نام ۱۰۰ میل کا بھی لیجئے تو اوسان خطا ہو جائیں ۔ اور ایک ریل ہی کیا آپ کی سائنس کو خدا سلامت رکھے ۔ موٹر اور ٹرام ، لاری اور سائیکل اور موٹر سائیکل ۔ ع

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا !

اور پھر آپ کی تجربہ گاہوں اور کارخانوں کی خوشبوؤں کا کیا کہنا! جس آن کو اٹھا کر دیکھئے ، ربڑ کی بدبو سے ناک بس جائے ۔ جس مشین کو چلایئے ، پٹرول کی گندگی سے دماغ اڑ جائے ۔ کیسی کیسی عطر بیز گیسیں ، کیا کیا شامہ نواز ایسڈ اور تیزاب میرے شہر نے ایجاد کر ڈالے ہیں ۔

میرزا صاحب ۔ جی ہاں نفاست تو ختم ہے سائنس والوں پر ، ان کی کسی لیبورٹری یا کسی فیکٹری میں جا نکلئے ، ممکن نہیں رومال ناک پر نہ رکھ لینا پڑے لیکن شیخ صاحب یہ آپ کی بھی زیادتی ہے کہ آپ سارا الزام ان ایجادوں ہی کے سر منڈھ دیتے ہیں ۔ بیجا مصرف جس چیز کا بھی کیجئے وہ بری بن جائے گی ، میرے خیال میں توشینوں کے استعمال کو صرف ضرورت کے وقت تک محدود کر دیا جائے تو ان کے نقصانات گھٹ تو یقیناً جائیں گے چاہے بالکل دور نہ ہوں ۔

میر صاحب ۔ آپ بھی مرزا صاحب کس کی باتوں میں آ گئے ۔ ہمارے شیخ صاحب تو وہ ہیں کہ دن دوپہر آفتاب ہی سے انکار کر بیٹھیں ۔ آنکھوں پر خاک جھونکنا اور کسے کہتے ہیں ؟ وہ دن بھول گئے ، جب رات میں قدم گھر سے باہر نکالتے ، تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ۔ یہ سائنس ہی کا کرشمہ ہے کہ شہر کا ہر گلی کوچہ بقعۂ نور بنا رہا ہے اور اب تو بجلی گاؤں گاؤں پہونچی جا رہی ہے ۔

شیخ صاحب ۔ جی ہاں وہ بجلی کے لیمپ نہ، جن کی شان میں حضرت اکبر قصیدہ خوانی کر گئے ہیں ۔ ع

روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

یہ بھی خبر ہے کہ جب سے یہ روشنیاں نکلیں، خاص لندن کی گلیوں میں جرموں کی تعداد گھٹی نہیں اور بڑھ ہی گئی ۔ لندن کی نائٹ لائف (شبانہ زندگی) پر تو مستقل کتابیں ڈھیروں کے محققین نے لکھ ڈالی ہیں کبھی ذرا آنکھیں اٹھا کر دیکھ لیا کیجئے "روشنی میں اندھیر" کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے ۔ اچھا جانے دیجئے، لندن اور پیرس کی اس تحقیق کو، ذرا یہیں کے کسی مبصر سے پوچھ دیکھئے کہ آتنی تیز تڑپ کا اثر بصارت پر کیا پڑتا ہے؟ کیا خوب ترقی ہے ۔ پہلے آنکھیں پھوڑ دیجئے ۔ پھر آنکھ کی کمزوری دور کرنے کے لیے عینکیں خرید یے" روشنی طبع کا بلا ہونا تو شاعروں کی زبان سے سنا تھا، اس روشنی برق کا بلا ہونا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں،
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں!

میر صاحب ۔ آپ تو ہر سیدھی بات کو الٹی کر دیتے ہیں ۔ لیکن میں بھی دیکھتا ہوں کہاں تک ہٹ دھرمی سے کام لیے جائیے گا؟ ایک اسی بات کو لے لیجئے کہ جب تک یہ پانی کے نل نہیں لگے ہیں، سقہ بہشتی کا رونا جھینکنا کیسا گھر گھر شور مچا رہا تھا اور اب وہی ہے کہ بے محنت، بے کھٹکے پانی چلا آ رہا ہے، ڈول رسّی کا جھگڑا، نہ پانی کھینچنے کی مشقت مزے سے جب چاہا، بمبہ کھول دیا، نہا لیے دھو لیے ۔

شیخ صاحب ۔ جی کیا کہئے ہیں واٹر ورکس کی برکتوں کے ۔ پانی ٹپ ٹپ کر اور ٹل کر بکنے لگا! یہ حد ہے تمدن کی! جس دیس میں گلی گلی سبیلیں لگیں اور جانوروں تک کے لیے پیاؤ چلا کریں ۔ وہاں آج دو دن کی دیر ہو جائے میونسپلٹی میں واٹر ٹیکس

داخل کرنے کی، چلئے پانی بند! ترسا کیجئے حلق تر کرنے کو۔

مرزا صاحب۔ اور یوں بھی تو پانی وقت ہی وقت آتا ہے، اتنے گھنٹے صبح، اتنے گھنٹے شام۔

شیخ صاحب! اور میں تو کہتا ہوں کہ صاف شفاف، بہتا ہوا، کھلا ہوا، پانی چھوڑ چھاڑ، بند، گھٹا ہوا، طرح طرح کی ترکیبوں سے کچے پکائے ہوئے پانی میں آخر جان ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اور گرمیوں میں تو بس مزہ ہی آجاتا ہے، وہ تپتے ہوئے نل اور کھولتے ہوئے پانی کی دھار۔ برف کا سہارا نہ ہو تو حلق جھلس کر رہ جائے۔

میر صاحب۔ تو آخر برف کیوں نہ پیجئے؟ اب کیا ایسی نعمت پیسہ دو پیسہ سیر میں مہنگی ہے۔

شیخ صاحب۔ جی کیوں نہ پیجئے۔ بڑے شوق سے پیجئے۔ چاہے دانتوں پر اور معدہ پر اور اعصاب پر جو کچھ بیت جائے۔ آخر برف بھی تو ہے نہ سائنس کی پیداوار اور مشینوں سے تیار ہونے والی نعمت!

میر صاحب۔ خیر، وہ کچھ بھی سہی، یہ فرمائیے کہ ایسے فائدہ استعمال اس دور سے پہلے کب تھے؟ سامان راحت سے ہیں، گھر سے بڑھ کر آرام دہ،

شیخ صاحب۔ اور یہ نئی نئی بیماریاں، اعصابی اور دماغی اور ہر ہر طرح کی جواب نکل پڑی، ان کے نام تک بقراط اور جالینوس نے کب سنے تھے؟ زہر خورانی کب اتنی عام ہوئی تھی؟ خودکشی کب آج کی طرح داخل فیشن ہوئی تھی؟ گندگی سے گندی بیماریاں اپنے ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی کب اس طرح انسان پر مسلط ہوئی تھیں؟ اور سب آئے بگڑے ہوئے سائنٹفک ایجادوں اور آلوں کی۔

مرزا صاحب۔ اجازت ہو تو ایک اصولی بات میں عرض کر دوں۔ مثل کے نام سے

تو آپ دونوں واقف ہی ہیں، وہی انگلستان کا مشہور فلسفی۔ ایک جگہ لکھ گیا ہے کہ نیچر اور آرٹ کے درمیان نسبت تضاد ہے یعنی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میرے خیال میں کچھ ایسا ہی رشتہ نیچر اور سائنس کے درمیان بھی ہے۔ گویا جو چیز جتنی زیادہ انسانی سائنس کی شرمندۂ احسان ہوگی، اسی قدر وہ طبعی اور فطری حالت سے دور ہوگی، ہے یہ بات کہ نہیں؟

میر صاحب۔ یہ موشگافیاں تو میں جانتا نہیں۔ سیدھی سی بات یہ دیکھتا ہوں کہ دوربین نے آسمانوں تک کو چھان ڈالا ہے۔ یوں کہیئے کہ ستاروں کی "مردم شماری" کر ڈالی ہے پھر یہ بھی سن لیجئے کہ فلاں ستارہ اتنا بڑا ہے، فلاں زمین سے اتنی دور ہے، فلاں کی رفتار اتنی ہے واللہ یہ عجائبات ہیں عجائبات!

شیخ صاحب۔ عجائبات کیوں؟ کہئے معجزات ہیں معجزات! قصور معاف یہ ارشاد ہو کہ اس ستارہ نوردی اور آفتاب گردی سے آخر حاصل کیا ہوا؟ انسانیت کی راہ کی کتنی منزلیں طے ہوئیں؟ یہ مسافتیں اور پیمائشیں نہ معلوم ہوتیں، تو انسان کی تکمیل انسانیت میں کون سی کسر باقی رہ جاتی؟ وقت اور قوت اور قوت کا صرف بے حساب، روپیہ کا خرچ بے شمار، اور پھر ہاتھ کیا لگا؟ مادی؟ روحانی؟ کچھ تو بتائیے۔ اس لاحاصل دوربینی اور ستارہ پیمائی سے تو ڈلیا ڈھونا اور گھاس کھودنا کیا برا ہے؟

میر صاحب۔ کیا خوب! بس معلوم ہوگئی آپ کی قدر دانی یہ کوئی ترقی ہی آپ کے خیال میں نہیں کہ خاک نشین انسان ہواؤں میں اڑنے لگا، طرح طرح کے اڑن کھٹولے ایجاد کر لیئے، ملکوں ملکوں کی سیر آناً فاناً کر ڈالی، آپ کے نزدیک یہ کوئی ترقی ہی نہ ہوئی؟

شیخ صاحب۔ اچھا تو معیار ترقی یہ ٹھہرا۔ مگر حضور والا، یہ ترقیاں تو آج سے نہیں ہمیشہ سے حاصل ہیں۔ جنگل کی چڑیوں کو۔ درختوں پر گھونسلا بنانے والے پرندوں کو، چیل اور کوّے اور گدھ اور کبوتر اور باز سب ہی ہواؤں میں خوب فراٹے بھر لیتے ہیں، منزلوں

کی خبر دم بھر میں لے آتے ہیں: حضرت انسان نے یہ بلند پروازی کے سبق جو کچھ سیکھے ہیں، انھیں جانوروں کو دیکھ کر سیکھے ہیں۔ یقین نہ آئے تو فن ہوابازی (AVIATION) کی جون سی کتاب چاہے اٹھا کر دیکھ لیجئے، یہ اقرار درج ملے گا۔

میر صاحب۔ خیر، اب آپ سے مغز کون خالی کرے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ جیسے جیسے عجیب اور نادر آلات جنگ آج جدید سائنس نے ایجاد کر لیے ہیں۔ رستم اور بھیم کے تو خواب و خیال میں کبھی نہ آئے ہوں گے۔

شیخ صاحب۔ یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا سائنس کی استادی کا، واقعی بات ہے کہ خوب ہی سکھا دیا آپ کے سائنس نے بھائی کو بھائی کا پھاڑ کھانا، جسم کے ریشہ ریشہ کو قیمہ کر ڈالنا، ہاتھ، پیر، کان، آنکھ، ناک کے پرخچے اڑا دینا، سائنس کی راہ سے جسم کے پور پور میں زہر اتار دینا! آپ سے زیادہ مانتا ہوں کہ یہ حصہ ہے آپ کے سائنس کا! میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ لطیف صنعتیں دیکھ کر جنگل کے شیر اور تیندوے ریچھ اور بھیڑیے، سانپ اور اژدہے، سب اپنے کان پکڑ کر رہ گئے۔ کیا بات ہے آپ کے سائنس کی! بات کی بات میں انسان کو درندوں سے بڑھ کر درندہ بنا ڈالا!

مرزا صاحب۔ اور اصلی جوہر تو سائنس کا میدان جنگ ہی میں کھلتا ہے۔ اخباروں میں آپ نے پڑھا نہیں کہ ایک صاحب کرۂ مریخ کے نہیں، اسی زمین کے، ڈھونڈوں کی لینے پر آئے تو بولے، خبردار جو کوئی میرے قریب پھٹکا، اپنے خفیہ اور بے پناہ حربہ کا وہ ہاتھ دوں گا کہ بھاگتے راہ نہ ملے گی۔ ادھر حریف کے ڈاکٹر آف سائنٹیفک ریسرچ نے گرج کر جواب دیا کہ مردود اس بھول میں نہ رہنا، یہ میرے محکمہ کے آٹھ سو سورما، تو ٹولیوں میں تقسیم، اپنا رات دن، کس دن کے لیے ایک کیے ہوئے ہیں[1]؟ عین وقت پر وہ شگوفہ

---

[1] پہلے فقرہ میں اشارہ روس کی طرف تھا اور دوسرے فقرہ میں برطانیہ کی جانب۔

چھوڑوں گا کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔

شیخ صاحب۔ تو یہ کہئے۔ ؎

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!

ہاں صاحب پڑھے جنوں کو اتارنا کوئی دل لگی ہے!

مرزا صاحب۔ میرے خیال میں تو گفتگو کو بہت طول ہوچکا۔ اب مجلس برخاست ہو، ہمارے میر صاحب بھی کچھ پریشان ہوچلے ہیں۔

میر صاحب۔ نہیں پریشانی کاہے کی، البتہ رہ رہ کر حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ ساری دنیا سے عنقا خیالات ہمارے شیخ صاحب ہی کے کیوں ہیں؟

مرزا صاحب۔ تو آپ کے خیال میں یہ بھی کوئی جرم ہے؟

شیخ صاحب۔ اور جرم ہو بھی تو تنہا بندہ مجرم ہے کب۔ رسکن اور کارپنٹر اور ٹالسٹائے اور خدا جانے کتنے تو یورپ ہی میں میرے ساتھ ہیں، باقی رہا ہندوستان تو کم از کم گاندھی جی کے انڈین ہوم رول کے اردو ترجمہ ہی دیکھ لیے جائیں!

مرزا صاحب۔ لیکن میرے نزدیک تو کچھ زیادتی آپ کی بھی ہے شیخ صاحب۔

شیخ صاحب۔ وہ کیا۔ کھل کر کہئے نہ؟

مرزا صاحب۔ زیادتی یہی کہ سائنس کو ایک سرے سے بُرا کہہ دیا جائے۔ اور مطلب تو غالباً آپ کا بھی یہ نہیں، سائنس کو در اصل جس چیز نے اتنا بدنام کر رکھا ہے اس کا غلط اور بیجا استعمال ہے، نہ کہ سائنس بجائے خود۔ سائنس تو بس ایک قوت ہے۔ جیسے آگ یا کسی پہلوان کا جسم۔ اب اگر پہلوان اپنی طاقت کو زور و ظلم میں صرف کرنے لگے تو یہ خطا پہلوانی کی نہیں، پہلوان کی ہوئی۔ آگ کو قابو میں رکھئے تو جو چاہیے خدمت لے ڈالیے۔ اور وہی آگ بے قابو ہوگئی تو آپ کو جلا ڈالے گی۔ یہی حال سائنس کا ہے انسانیت کو اس پر حاکم رکھئے تو نعمت ہی نعمت اور جو کہیں اس کو انسانیت پر حاکم بنا دیا تو لعنت ہی لعنت۔

شیخ صاحب ۔ اے زندہ باد۔ کیا خوب فیصلہ کر دیا ہے میں تو خود اسی نتیجہ کی طرف لا رہا تھا۔ ہمارے ہاں کے حقیقت شناس تو صدیوں پیشتر یہی فیصلہ کر گئے ہیں ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

علم کو کہیں آپ نے نفس کے تابع کر دیا تو سانپ اور اژدہا بن کر رہے گا۔ اور اگر عقل سلیم کے تابع رکھا تو اس سے بڑھ کر رفیق اور کون ؟ ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی ست　　آب اندر زیر کشتی پشتی ست

پانی اگر کشتی کو اٹھائے ہوئے ہے تو رحمت ہی رحمت اور کہیں پانی کشتی کے اندر آگیا تو ہلاکت ہی ہلاکت ۔ بس قیامت !

مرزا صاحب ۔ سبحان اللہ! ایسے عارفوں کے کلام کا کیا کہنا ۔ اچھا تو اجازت ہے نہ ؟

میر صاحب ۔ آداب عرض ہے ۔

شیخ صاحب ۔ خدا حافظ ۔

مولانا محمد علیؒ[۱]

نومبر ۱۹۲۶ء کا مہینہ ہے اور شروع کی کوئی تاریخ ۔ ایک خوشگوار شام کو ببمئی لکھنؤ میل کانپور سے چھوٹنے کے قریب تھا کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے موٹر پر بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں اور جھٹ ٹکٹ لے لوا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیروں کی مدد سے پھینک پھانک سکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں داخل ہوگئے ۔ دو انگریز بمبئی کے پہیے سے بیٹھے چلے آرہے تھے ۔ دونوں نو وارد کھدر پوش، عبا پوش ۔ ایک وجیہہ، خوش قطع دوسرا کریہ منظر و بد قوارہ ۔ دونوں داڑھی باز ۔ ان نو واردوں کو دیکھ کر انگریز کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے ۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں خوش قطع نو وارد اسی برتھ پر بیٹھ گیا جس پر دونوں صاحب بہادر جمے ہوئے تھے ۔ دوسرے نے مقابل کی نشست اختیار کی ۔ گاڑی چلی ۔ گنگا کا پل بات کہتے آگیا ، ایک صاحب بہادر دونوں کی طرف دیکھ کر چھیڑ کی مسکراہٹ سے ہنسے اور منہ بنا کر بولے (THIS IS MOTHER GANGA) یہی گنگا مائی ہے) طنز اور زور (MOTHER

۱؎ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۱۸ مارچ ۱۹۴۰ء کو وقت ۱۵ منٹ (بہ سلسلہ "کیا خوب آدمی تھا")

پر تھا۔ اس کے کمد رپوش نے معاً چاء کی پیالی منہ سے ہٹا کر انگریزی زبان اور انگریز کے لہجہ میں جواب دیا: "اچھا! آپ یہ ماں اور موسی کا رشتہ لیتے ہیں! میں جانتا تھا کہ دریا، دریا ہے اور بس" صاحب یہ تڑاق سا جواب پاکر سناٹے میں آگئے۔ برجستہ جواب دینے والا تھا محمد علی۔ اور اس کا ساتھی یا "تابع مہمل" آپ کا یہ خادم۔

صاحب کو یہ گمان نہ تھا کہ یہ چہرے پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ انگریزی میں جواب دے سکے، اور وہ بھی شستہ اور برجستہ! چپ سادھ کر رہ گئے، اور اس کے بعد ادھر سے منہ پھیر گفتگو اپنے پرانے رفیق سفر سے شروع کی۔ لندن سے کرکٹ کی مشہور و معروف ٹیم "ایم سی سی" نئی نئی شاید پہلی بار ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ موضوع گفتگو یہی ٹیم تھی، اور اس کے کھیل اور مختلف میچ۔ محمد علی تھوڑی دیر تو چپ سنتے رہے۔ اس کے بعد نہ رہا گیا۔ بولے "دخل در معقولات معاف۔ کھلاڑیوں پر آپ جو رائے زنی کر رہے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی" اور لگے اس کی تفصیل بیان کرنے۔ اور صاحب تھے کہ بھو چکے بنے، ایک مُلّا نما انسان کی زبان سے یہ ماہرانہ معلومات سُن رہے تھے! محمد علی اب نفس کرکٹ پر آگئے اور لگے انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان کرنے۔ لندن میں اور آکسفورڈ میں فلاں سنہ میں بولنگ کے یہ طریقے رائج تھے۔ گیند کی پچ یوں پڑتی تھی۔ بیٹنگ یوں کی جاتی تھی۔ فلاں زمانہ میں یہ تبدیلیاں ہوئیں، ہندوستان اور انگلستان دونوں کی زمینوں میں یہ فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔ بولنے والا اب گفتگو نہیں کر رہا تھا، گویا کرکٹ پر کسی انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل سنا رہا تھا! آخر میں صاحب بولے "آپ کو بڑے معلومات کرکٹ کے متعلق ہیں" محمد علی نے کہا "مجھی کو نہیں ہر

علیگڈھی کو ایسے ہی معلومات ہوتے ہیں، وہ بولا " کیا آپ علیگڈھ میں کپتان رہ چکے
ہیں؟ " یہ بولے " نہیں میں تو نہیں، میرے بڑے بھائی (BIG BROTHER)
البتہ تھے " شوکت صاحب کے لیے یہ (BIG BROTHER) کا لقب محمد علی ہی
نے اپنے کانگریس کے خطبہ صدارت کے وقت سے چلا دیا تھا۔ وہ انگریز اس پر بیساختہ
بولا ' (YOU TALK LIKE MOHD. R. ALI) " تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں " یہ
فوراً بولے " I AM MOHD. ALI " (زبان کیسی) میں خود ہی محمد علی ہوں " صاحب
بہادر کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے " REALLY ONE
OF THE TWO A. I BROTHERS " (ارے! تو ہی محمد علی جو علی برادران میں
سے ہیں) انھوں نے چمک کر جواب دیا " YES THE

YOUNGER AND MORE SHARP-TONGUED OF THE TWO " جی ہاں
عمر میں چھوٹا زبان درازی میں بڑھا ہوا!) صاحب کو اپنی حیرت کے رفع کرنے میں
اب کی دیر سکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی۔ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ پہلو بدل
رہے تھے اور نظر محمد علی کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھی۔

محمد علی نے اب ہنسنا اور لطف لینا شروع کیا، بولے گھبرائیے نہیں کیا آپ یہ
سمجھ رہے ہیں کہ علی برادران جب انگریز کو دیکھ پاتے ہیں اس پر جست کر بیٹھتے ہیں۔
دیکھ لیجئے نا میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں، حملہ کا خیال ہی دل میں نہ لائیے۔ بمبئی
کا مشہور انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا اس وقت انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور علی برادران کا
شدید مخالف تھا۔ صاحب نے اس کا تازہ پرچہ آگے بڑھایا۔ محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں۔ البتہ
اس کے ایڈیٹر پر خوب فقرے کسے[1]۔ داستان خاصی طویل ہو گئی۔ اور ایک ہی قصہ کو کہاں تک کھینچے جائیگا۔

---

[1] اس وقت کے چیف ایڈیٹر کا نام اتفاق سے SHEPARD تھا جس کا املا اور تلفظ دوسرے لفظ
SHIPE D سے ملتا ہوا تھا۔ جس کے معنی گلہ بان یا گڈریے کے ہیں۔ محمد علی نے کہا

ایک بار ۱۹۲۰ء میں محمد علی بحیثیت صدر وفد خلافت انگلستان میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ وقت کل پانچ منٹ کا ملا۔ انھوں نے تمہید یوں اٹھائی کہ میں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے تیس کروڑ آبادی کی نمائندگی کرنے آیا ہوں؟ اب آپ خود ہی حساب لگالیجئے۔ کہ فی منٹ نہیں، فی سکنڈ بھی نہیں، ہر سکنڈ کی کسر میں کتنوں کے خیالات وجذبات آپ تک پہونچاؤں گا"۔ آوازیں آنے لگیں آپ کہے جائیے کہے جائیے، اور ہر پانچ منٹ کے بعد پانچ ہی پانچ منٹ اور بڑھتے رہے، یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہوگئے!

اسی سفر لندن کا ایک اور منظر، مولانا مخالفین کے مجمع میں تقریر کر رہے ہیں کہ صلح کے وقت ہم استنبول کس طرح چھوڑ سکتے ہیں، تھریس اور سمرنا تو پھر غنیمت ہے۔ لیکن استنبول سے تو ہماری تاریخ وابستہ ہے.. یہیں تک پہونچے تھے کہ ایک گوشہ سے آواز آئی، یعنی یعنی؟ استنبول آخر کب سے آپ کے قبضہ میں ہے؟ جواب میں دیر کیا تھی، کھٹ سے ارشاد ہوا کہ کوئی فاضل تاریخ مجھ سے سنہ دریافت کر رہے ہیں۔ اس وقت تو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے پاس ہندوستان ہے اس کے تگنے زمانہ سے ہمارے پاس استنبول ہے! جلسہ لوٹ لوٹ گیا اور فاضل تاریخ کی آنکھ پھر اونچی نہ ہوئی۔

ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر وشاعری کا تھا۔ محمد علی خود بھی شاعر تھے۔ اور شاعری کی دنیا میں نام تھا۔ جوہر، سب سے بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تخلص تجویز کرتا ہوں اسی وزن اور

(بسلسلہ ۱۸۳) میں اس کے اخبار کو کیا پڑھوں گا خود اس کو پڑھ چکا ہوں میرے زمانہ آکسفرڈ میں تھا۔ جب بھی اسے کچھ نہیں آتا تھا اور اب بھی کچھ نہیں آتا اس کے بعد فرمایا ایڈیٹری تو نیر گلو باراں کے بہت سی دیکھنے میں آئی ہیں لیکن اب گلو باراں ایسا دیکھنے میں آیا جس کے گلے میں کوئی لکیر نہ ہو۔

قافیہ میں "شوہر"
شیفتہ کی مشہور غزل نادانیوں میں ہم پشیمانیوں میں ہم پر غزل کہنے بیٹھے تو مطلع
فرماتے ہیں ؂
کیوں شہر چھوڑ جا رہیں دہقانیوں میں ہم　　مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم
علیگڈھ کے ایک مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔ اس کے
ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں ؂
یہ ظلم ہے کہ سب کو کرد ایک سا خیال　　پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم
خود بیجاپور جیل میں قید تھے۔ بحیم و شحیم بڑے بھائی راج کوٹ جیل میں پڑے پڑے
دُبلے ہو گئے تھے۔ ان کی زبان سے ادا کیا ہے ؂
شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں　　پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم
ابھی نوجوان ہی تھے کہ علیگڈھ کالج میں طالب علموں نے زبردست اسٹرائک کی عین
اسی زمانے میں سرسید کی برسی کا دن آیا۔ اور اسی دن اولڈ بوائز نے بھی اپنا سالانہ جلسہ
منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عریضہ سرسید کی روح کی خدمت میں اپنے
ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؂
خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو　　ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
سرسید کے عقائد دعا و قبول دعا کے بارہ میں ملحوظ خاطر رہیں۔
یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو　　وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں علیگڈھ میں　　اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو
ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا ؂
بولی اماں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو
یہ سب جیل کے باہر تھا۔ جیل کے اندر خود محمد علی کیا کہہ رہے تھے ؂

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے ۔ بر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو ۔ خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا ۔ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ تھی آپ بیتی کا ایک ٹکڑا تھا۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر چہیتی اور لاڈلی سنہ ۱۹۳۲ء میں ابھی جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی آمنہ بی بالی پوسی۔ جوان، شادی شدہ، دق میں مبتلا ہوئیں اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور و مقید چاہنے والے باپ پر کیا گزری ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنے نازوں کی پالی نورِ نظر کے واسطے کیا بلبلا یا ہوگا۔ تلملا یا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا۔ کچھ زور نہ چلا تو عالمِ خیال ہی میں بیٹی سے کہنے لگے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں ۔ تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے ہی کو یوں تسکین بھی دینے لگے ؎

امتحان سخت سہی پر دلِ مومن ہے وہ کیا ۔ جو ہر اک حال میں اُمید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ ۔ اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا ۔ تخرج الحی من المیت مذکور نہیں
تری قدرت سے خدایا تری رحمت سے نہیں کہ ۔ آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے کہ سرنوشت کا نوشتہ مٹتا نہیں۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر الٰہی کیا فیصلہ کر چکی ہے۔

کہتے ہیں اور کلیجہ تھام کر کہتے ہیں ؂

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُسکو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

محمد علی کو قوم و ملت کے پیشوا، ملک کے سردار کی حیثیت سے لاکھوں نے جانا کروروں نے پہچانا، ان سب سے زیادہ خوش نصیب وہ تھے جنھوں نے محمد علی کو قریب سے بحیثیت دوست کے عزیز کے۔ انسان کے دیکھا۔ کیا بیان کیا جائے، کیسی نعمت انھیں ہاتھ آگئی تھی، ایک صداقت مجسم۔ ایک پیکر اخلاص۔ جرأت، دیانت، ہمت بے خوفی کا مجسمہ، پاس والے جتنا قریب سے دیکھتے گئے۔ حضرت جوہر کے جوہر اور زیادہ کھلتے گئے، نکھرتے گئے۔ مشہور تمام تر ایک بے باک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تھے، لیکن ان کے لغت میں ڈپلومیسی کا لفظ ہی نہ تھا۔ ظاہر و باطن یکساں، جو خیال جس کے متعلق دماغ میں آگیا، زبان سے ادا کر دیا۔ جو بات دل میں آئی منہ پر آئے بغیر نہ رہی، کہتے ہیں کہ اہل سیاست وہ ہوتے ہیں جو۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ محمد علی اس معنی میں اہل سیاست قطعاً نہ تھے، ایک بار نہ تھے، ہزار بار نہ تھے، محبت کے پتلے تھے، مہر و الفت کے بندے تھے۔ بیوی بچوں کے عاشق زار دوستوں، رفیقوں، ساتھیوں پر سو جان سے نثار اور درد کا واسطہ رکھنے والوں کے مونس و غمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے، میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ مسلمانوں کے اور عالم اسلامی کے ساتھ شیفتگی کی یہ کیفیت کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن یہاں ہندوستان میں بیٹھے محمد علی محسوس کریں:

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" یہ مصرعہ بار بار سننے میں آیا تھا اور دل ہمیشہ اسے نری شاعری سمجھا، محمد علی کی زندگی نے سمجھا دیا کہ شاعری کبھی حقیقت مجسم بن جاتی ہے۔ لوگوں کو مہمان بنانے۔ کھانا کھلانے۔ خاطریں کرنے کے حریص تھے۔ ایک نہیں۔ دو جوان بیاہی سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اٹھایا۔ قبر میں سلادیا

دل ان ذاتی صدموں کی تاب کہاں تک لاتا قومی صدمے ان سے بڑھ چڑھ کر۔ جیے اس کے بعد چھ سات سال اور زندگی کا ثبوت بہت سے زندوں سے بڑھ کر دیتے رہے لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نہ ہنڈیا تھا نہ چینے۔ ہنستے رہے۔ بوتے رہے گرجتے رہے لیکن اندر ہی اندر جلتے گئے، پھکتے گئے، پگھلتے گئے۔ مذہب کے دیوانے تھے، پروردگار سے ایسا عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے، جب اس مضمون کی آیتیں آتیں کہ منافقوں کو دیکھو تو بجائے اللہ کے یہ اللہ کے بندوں سے ڈرتے ہیں۔ تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بار بار ان آیتوں کی تکرار کرتے۔ ان الحکم الا اللہ تو گویا تکیہ کلام تھا۔

۴۔ اور ۵۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی درمیانی شب، میں جو مسلمانوں کے یہاں پندرھویں شعبان کی متبرک رات تھی۔ جب روئے زمین کے مسلمان بڑے ذوق وشوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا اور عقبیٰ کی، دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے مشیتِ الٰہی نے ان سے یہ نعمت واپس طلب کر لی۔ شاید اس لیے کہ محمد علیؒ کے اہل وطن، اہلِ ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوتے۔ جان لندن میں جان آفریں کے سپرد کی اور آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سر زمین مقدس میں قبلۂ اول کے قریب، جامع عمرؓ سے متصل۔ اقبال کو الہام ہوا۔ ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

ماتم دشیون کی صدائیں ہندوستان بھر میں اور سارے عالم اسلام میں اس زور شور سے اٹھیں اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

"ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لیے ہے" انھیں کا مصرع ہے اور یہی تو خود فرما گئے تھے ؂

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

امیر خسروؒ[1]

بزرگ اور درویش کی حیثیت سے

خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سُنا ہوگا۔ کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی پوچھے! کتاب کی کتاب ازبر تھی، زیادہ نہیں، پشت ہی دو پشت اُدھر کی بات ہے کہ کتاب مکتبوں میں چلی ہوئی تھی۔ گھروں میں پھیلی ہوئی تھی، زبانوں پر چڑھی ہوئی تھی، گویا اپنے زمانۂ تصنیف سے صدیوں بعد تک مقبول و زندہ مشہور و تابندہ۔

دستِ قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھ دی تھی، جس کے کلام کو حسن قبول کی یہ دولت دے دی تھی، اُسی کا نام تھا امیر خسرو، امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار۔ شعر و ادب کے دیوان اس کی ادبی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبۂ روحانی سے آگاہ۔ سرِ مشاعرہ آجائے تو میرِ محفل اسے پائیے۔ خاندانِ چشت اہلِ بہشت کے کوچہ میں آنکلے تو حلقۂ ذکر

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۸ر نومبر ۱۹۳۰ء کو وقت ۱۰ منٹ۔

وفکر میں سرِ مسند جلوہ اس کا دیکھئے۔ اچھے اچھے شیخ دم اُس کا بھر رہے ہیں۔
معرفت و طریقت کے خرقہ پوش، کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں۔

والدین نے نام ابوالحسن رکھا۔ شہرت عام کے نقیب نے امیر خسرو کہہ کر پکارا
سال ولادت ہجری کا چھ سو باون اور عیسوی کا بارہ سو ترپن۔ ترکستان کے علاقہ
بلخ میں کوئی بستی ہزارہ کہلاتی تھی، یہ گوہر اُسی کان سے نکلا ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین
کے نام سے موسوم تھا، یہ جوہر اسی خاندان سے چمکا، والد بزرگوار کا نام تھا امیر
شمس الدین محمود شمسی۔ چنگیز خاں کے زمانے میں ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچے
یہاں ایک مقام پٹیالی عرف مومن آباد تھا۔ وہاں آ بسے، پرانے تذکرہ نویسوں
نے دھندلی سی نشان دہی کی ہے کہ شہر کہیں نواح سنبھل یا مضافات دہلی
میں تھا۔ نئے جغرافیہ نے نقشہ پر انگلی رکھ کر دکھایا کہ ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے
شادی یہیں ہوئی۔ بستی کے نامور اور درویش منش رئیس اور سلطنت منصبدار
نواب عماد الملک کی صاحبزادی کے ساتھ۔ یہاں امیر کی پیدائش بھی ہوئی۔

تاریخ خوش اعتقادی کی زبان سے روایت یہ بیان کرتی ہے کہ پڑوس میں
کوئی مجذوب رہتے تھے۔ صاحبِ کشف لوگ خرقہ میں لپیٹ کر بچہ کو ان کی خدمت میں
لائے دیکھتے ہی بولے "کس کو لے کر آئے ؟ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر رہے گا
مجذوب صاحب کی نگاہ کشفی شاعری کی حد تک رہی۔ بچہ نے بڑے ہو کر نقرو
درویشی میں وہ کمال حاصل کیا کہ خود شاعری منہ دیکھتی رہ گئی۔

تعلق عمر بھر کہنا چاہئے کہ سرکار دربار سے رہا۔ کبھی براہ راست شاہی
دربار سے اور کبھی اُمرائے نامدار سے۔ اور سرکاریں دو ایک نہیں، خلجی اور تغلق
ملا کر سات بادشاہوں کی دیکھ ڈالیں، پھر شخصی سلطنتوں کی نیرنگیاں۔ انقلابات
کے طوفان قیامت خیز۔ دیس میں بھی رہے، پردیس بھی گئے، بنگال بھی گھومے۔ اودھ

کی بھی سیر کی۔ لیکن دل جہاں اٹکا تھا وہیں اٹکا رہا۔ نظر جس رُخ پر ایک بار پڑی تھی اُس پر جمی رہی۔ ابھی آٹھ برس کے تھے کہ عقیدت مند باپ نے لاکر سلطان الاولیا خواجہ نظام الدین کے قدموں پر ڈال دیا۔ سن رُشد کو پہونچے تو بیعت کی تجدید کی۔ بیعت رسمی نہ تھی، ایک نسبت عشقی تھی کہ دونوں طرف سے قائم ہوگئی تھی، خواجہ کا مرتبہ دیارِ محبت و معرفت میں اس سے ظاہر ہے کہ اولیا و کرام نے، مقبولین اِنام نے، بقا و دوام کے دربار میں محبوب الٰہی کہہ کر پکارا۔ امیر کو دولت ملی، محبت کی بھی محبوبیت کی بھی، تذکروں کی روایت ہے کہ جس روز تجدید بیعت کی ہے، سارا ساز و سامان کھڑے کھڑے لٹا دیا ــــــ جو دل نثار کر چکا ہو، اُسے دولت لٹا دینے میں دیر ہی کیا لگ سکتی ہے؟

کہتے ہیں کہ آج سے پہلے، بہت پہلے، کوئی چھ سات سو برس پہلے، باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر، دہلی جاتے ہوئے، ایک سرا میں آکر اُترے۔ کنیزیں، خدّام، زر و جواہر، بیش قیمت مال و اسباب، سب ہی کچھ ساتھ۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں ایک دوسرا مسافر، مفلس و مفلوک الحال دہلی سے واپس ہوتے اسی سرا میں ٹھہرا۔ رئیس کو بوئے اُنس محسوس ہوئی، بڑھ کر پوچھا کدھر سے آنا ہوا؟ جواب ملا دہلی سے! پوچھنے والے کا اشتیاق دہلی کا نام سُن، تیز ہوا۔ پوچھا اُس شہر میں ایک درویش خواجہ نظام الدین ہیں۔ وہاں کبھی حاضری کا اتفاق ہوا تھا؟ مفلس بولا ــ اتفاق کیسا، اُنھیں کے پاس تو گیا تھا، حاجت مند ہوں، چاہتا تھا کچھ مل جائے میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہ تھا۔ پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں پڑی تھیں، وہی پیر حوالہ کر دیں، اُنھیں کو لیے چلا آرہا ہوں۔ سننے والا اب شوق و اشتیاق سے بے چین تھا بولا خدا کے لیے، وہ جوتیاں میرے حوالہ کر دو۔ اور یہ میرا ساز و سامان سب تمھاری

نذر ہے! ادھر رئیس صاحب اپنے ہوش میں تھے کب، اور ہنسی، دل لگی کی سکت ہی ان میں کہاں تھی؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار یا پانچ لاکھ میں پڑا، اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اُتری جوتیاں آنکھوں سے لگاکر، سر پر رکھ کر پگڑی کے اندر لپیٹ لیں، اور ایک وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے ــــ جوتیاں جن محبوب کی تھیں، وہ تو وہی ہیں جنھیں زبانِ خلق محبوب الٰہیؒ کے نام سے پکارتی ہے اور امیر تو ہی امیر خسروؒ تھے، جن کا یہ فارسی شعر اس وقت سے اب تک خدا معلوم کتنے دلوں کو حال وقال کی کتنی محفلوں کو گرما چکا ہے ؎

متاعِ وصلِ جانان بس گران ست
گراین سودا بجان بودے چہ بودے

یہ رقم تو خیر لاکھوں ہی کی تھی، شاعر تو یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب تک رسائی اگر نقد جان کے معاوضہ میں ہو جائے تو بھی یہ سودا نہایت ارزاں ہے!

آگے چلئے، دنیا کی عمر چند سال اور کھسکی۔ خلجی و تغلق کی بہار ختم ہو چکی، دہلی کے تخت پر اب آلِ تیمور کا اقبال چمک رہا ہے۔ سخن سنج و سخن گستر بادشاہ کے حضور میں محفلِ سماع گرم ہے۔ قوال جب اس شعر پر پہنچا ؎

تو شبانہ می نمائی، بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

بادشاہ کا ذہن قدرةً شعر کے ظاہری مفہوم کی طرف گیا۔ اور قریب تھا کہ شاعر کی بے حیائی کا خمیازہ قوال غریب کو عتاب سلطانی کی شکل میں اٹھانا پڑے کہ ایک مزاج داں و ادب شناس صاحب نے جھٹ ہاتھ باندھ عرض کی کہ "پیر و مرشد غزل خسرو کی ہے۔ تصویر کھینچ رہے ہیں، اپنے تہجد گزار، شب بیدار، محبوب

محبوب الٰہی کی ساری رات کن کن اذکار کن کن اشغال میں گزرتی، کون کون سے احوال ومقامات طے کئے کہ رات بھر جاگنے کا افسوس وقت تک باقی ہے!"

متاعتاب لطف میں اور ناگواری واہ میں تبدیل ہو کر رہی۔

وقت کی محدود گنجائش کی رعایت سے صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ورنہ غزلوں کی غزلیں نہیں دیوان کے دیوان لبریز ہیں انھیں مقامات و احوال کی تلمیح سے، رموز و اسرار عارفانہ کی توضیح سے۔ ہندی کے دوہے اور ٹھمریاں ایک دو کی تعداد میں نہیں، پچاسوں اور سیکڑوں سب میں یہی نقشہ جما ہوا، یہی رنگ بھرا ہوا۔ تذکرہ نویسوں کی روایت ہے کہ مرشد خود فرمایا کرتے تھے کہ" خدا قیامت میں پوچھے گا، کیا لائے ہو، جواب میں عرض کروں گا کہ خسرو کو"۔ گریہ و مناجات میں ہوتے تو عرض کرتے کہ الٰہی میری مغفرت اسی ترک کے سوز دل کے طفیل کردے! مرشد کا وسیلہ پکڑتے ہوئے سب نے دیکھا ہے، مرید کے وسیلہ بننے کی مثال ایسے ہی کے نصیب میں آئی!

سوز دل اور ذوق عبادت کا عالم یہ تھا کہ پچھلی رات نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو کہنے والوں کا بیان ہے کہ سات سات پارے قرآن مجید کے پڑھ جاتے! دل جب تک ایسا ہی درد وخشیت سے لبریز نہ ہو، اتنا بڑا مجاہدہ کس کے بس کی بات ہے؟ اودھ میں ایک بڑے رئیس کے دربار میں تھے، ماں نے دلی میں یاد کیا، معقول مشاہرہ پر لات مار ماں کے پاس پہونچے۔

ماں کی وفات پر، پر درد مرثیہ کہا، بقول مولانا شبلی، اڑتالیس سال کی عمر میں ماں کی یاد میں اس طرح آنسو بہاتے ہیں کہ گویا کوئی کم سن بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ یہ سب پرتو ہے اسی سوز وگداز کا جس کا واسطہ دلا دلا کر خود مرشد علیہ الرحمۃ اپنی نجات کے طالب رہتے تھے۔

۷۲۵ھ کا ماہ ربیع الثانی تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ جنت کو سدھارے۔ امیر اس وقت بنگال میں تھے، خبرِ وحشت اثر سنی تو بھاگا بھاگ دلّی پہونچے، مزار پر حاضر ہوئے تو ماتمی اہل ارادت کی روائت ہے کہ ہندی کا شعر اُسی وقت پڑھا ؎

گوری سوئے سیج پر، منہ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے، سانجھ بھئی چو دیس

ماتمی لباس پہن لیا۔ سب کچھ لٹا دیا۔ خالی ہاتھ ہو بیٹھے۔ غم کی آگ میں جلتے، ہجر کی بھٹی میں تڑپتے، خود اپنے وقت کا انتظار کرنے لگے، ادھر چھ مہینے کی مدت پوری ہوئی کہ اُدھر ۱۸ شوال ۷۲۵ھ (مطابق ۱۳۲۵ء) کو خود بھی اپنے محبوب سے جا ملے ــــ حضرت فاطمہ زہرؓا بھی مرشد کائنات کا غم اس سے زیادہ مدت تک نہ برداشت کر سکی تھیں ــــــــــ تجویز یہ پیش ہوئی کہ دفن مرشد ہی کی تربت میں کیئے جائیں۔ احترام شریعت غالب آیا، پائینتی کی جانب چند گز ہٹ کر قبر بنی اہل دل اپنا تجربہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آستانۂ سلطان المشائخ سے پہلے اگر اس کشتۂ عشق و محبت اور مجسمہ سوز و گداز کے مرقد پر فاتحہ خوانی کر لی جائے تو دل کی انگیٹھی کی چنگاریاں کچھ اور تیز و روشن ہو جاتی ہیں!

۵

محمد علیؒ کے خطوط[1]

نوجوانی سے لے کر اپنے قبل از وقت بڑھاپے تک محمد علیؒ "یورپ" "سمندر پار" چند بار گئے۔ اور خط ہر دفعہ وہاں سے بہت سے لکھے، لیکن شروع میں ان خطوں کو کون محفوظ رکھتا؟ اس وقت کسے خبر تھی کہ گونڈوں کا کھلایا ہوا لڑکا، ساتھ کا کھیلا ہوا نوجوان ایک روز شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا؟ آخر کے خطوط بے شک بہت سے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس، لیکن وہ زیادہ تر اخلاقی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز۔ اُنھیں کوئی ریڈیو پر کیسے لائے۔ ہر خاص و عام کو کیسے سنائیے؟ اس ذخیرہ کے علاوہ بھی جتنے ہیں، اتنے زاید ہیں کہ کوئی انھیں پھیلانے پر آئے تو آج کا سارا پروگرام اسی ایک عنوان کی نذر ہو جائے۔ داستان گو تھک جائے اور داستان ختم نہ ہو پائے۔

محمد علی "مولانا" تو بہت بعد کو ہوئے، شروع میں مدتوں "مسٹر" رہے مسٹر ہی کہلائے۔ پہلا سفر ۱۸۹۸ء میں کیا، جب پرانی صدی کے ختم ہونے کے دو سال رہ گئے

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے (بہ سلسلہ مشاہیر کے خطوط سمندر پار سے) اپریل ۱۹۴۹ء میں۔ وقت ۱۵ منٹ۔

تھے۔ سن اُس وقت بیس سال کا تھا، دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں گیا، جب نئی صدی کو شروع ہوئے بھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ سن اس وقت ۲۴ سال کا۔ دونوں سفر طالب علمی کے سلسلہ میں تھے۔ رہے زیادہ تر آکسفورڈ اور لندن میں۔ مشغلے اسی سن و سال کے لائق اور مراسلے انھیں مشغلوں کے مناسب حال۔ انگریزی میں لکھے ہوئے بڑے بڑے طویل مراسلے علی گڈھ منتھلی میں (OXFORD DIDLINGS) کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ تذکران میں زیادہ تر ہوتا کالج کے کھیل کود کا، ہم جولیوں کی ننگ رلیوں کا، اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا، اُس دور سے یقیناً آپ کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔

تیسری بار انگلستان جانا ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ اب محمد علی ملک کے ممتاز جرنلسٹ اور انگریزی کے مشہور انشاء پرداز تھے۔ کامریڈ عرصہ سے نکل رہا تھا۔ اور اب ہمدرد بھی نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ کانپور میں ایک نئی نکلنے والی سڑک کی زد میں ایک مسجد کا گوشہ آرہا تھا، اس پر قدرۃً ایک سخت ہیجان برپا ہوگیا تھا، اور معاملہ شہر، بلکہ صوبہ کے حدود سے نکل کر "آل انڈیا" بن چکا تھا۔ محمد علی مسلم لیگ کے سکریٹری کو ساتھ لے، چپ چپاتے لندن روانہ ہوگئے کہ وہاں جاکر اس معاملہ اور ایک ہی کیا۔ ملک کے بہت سے معاملات پر انگلستان کے بڑے لوگوں سے ملیں ملائیں، دلوں کو گرمائیں، طبعتوں کو شرمائیں، تقریر سے، تحریر سے، قلم سے، زبان سے، غرض وہاں پہونچکر ہندوستان خط بہت سے لکھے، عموماً انگریزی میں، اکثر کامریڈ میں چھپ بھی گئے، انھیں پڑھ کر نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے اس وقت کے ہندوستان کا، اُس وقت کے ہندی مسلمان کا، اُس وقت کے انگلستان کی شان و شوکت کا۔ ناکامیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں: ہمت پست نہ ہوئی۔ دعوتیں، ضیافتیں محمد علی کی بکثرت ہوئیں، لندن میں بھی اور اڈنبرا اور نیوکاسل میں بھی، ان جلسوں اور صحبتوں میں شریک انگلستان کے بہت سے چوٹی

کے مشاہیر ہوئے، مثلاً اہل قلم و اہل صحافت میں ایچ جی ویلز، جی کے چسٹر ٹن
اے جی گارڈنر، سی پی اسکاٹ، جے اے اسپنڈر، ویلنٹائن ڈکس اور آئرلینڈ
کے مشہور شاعر ڈبلو، بی، ایٹس۔ اہل سیاست میں ریمزے میکڈانلڈ، کیر ہارڈی
جان ڈلن، آبرے ہربرٹ، ڈاکٹر وڈفرڈ، مسٹر ٹمونسن وغیرہم، کچھ ایسے مشاہیر
بھی تھے، جو عین وقت پر خود آنے سے معذور ہوگئے اور اپنے بجائے اپنے معذرت
نامے بھیج دیے، مثلاً برنارڈشا، مسٹر بلنٹ وغیرہم۔ محمد علی ان جلسوں سے
خوب کام نکالتے۔ جو کچھ کہنا ہوتا۔ انھیں موقعوں پر کہہ ڈالتے۔ ان کے طویل مراسلے
ٹائمز میں تو بار نہ پاتے، البتہ دوسرے مشہور اخبارات میں ان کے بیانات نکلتے رہتے۔
لارڈ ہیڈلے اس زمانہ میں نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور لیڈی ایولین کوبولڈ تو ان سے
قبل ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ان راستوں سے بھی محمد علی نے انگلستان کی سوسائٹی
کے اندر رسوخ پیدا کر لیا، اور اپنے مشن میں کچھ ایسے ناکام نہ رہے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۳ء
کے کامریڈ میں جو مراسلہ نکلا ہے، اس میں اس سفر پر گویا تبصرہ کرتے ہیں:-

"۲۷ر نومبر کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے
رہے ہیں، اس لنچ کی حیثیت سیاسی اور نزاعی نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا
کہ ہم ہندوستان اور انگلستان، اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے
سکیں، اور تاکہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزوں دونوں کو بتادیں کہ وہ ہمارے
ملک اور ہمارے مذہب سے ایسے بےتعلق تو نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکے ہیں۔
بلکہ ہمارے عزم، اور ہمارے مقصد اور گلے شکوے خود ہماری زبان سے سن لیں
مشہور افسانہ نگار ایچ جی ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے، بلکہ اب کی جمعہ کو تو ان
میاں بیوی نے ہمیں اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کر دیا ہے، اور وقت بھی
میری خاطر سے سوا آٹھ کا رکھا ہے کہ میں اس وقت تک ہندوستان کی ڈاک

سے فارغ ہو جاؤں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ہندوستان اور اسلام کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے خبری اور جمود دور کرنے اور انھیں بار بار چونکاتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگ ہندوستان سے بار بار آتے اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں۔ میں بحیثیت مجموعی مایوس نہیں ہوں:

محمد علی اب ملک و ملت یعنی ہندوستان اور اسلام دونوں کے سفیر تھے اور یہ دوہرا نقطۂ نظر قائم ہو چکا تھا۔ چوتھا سفر انگلستان اور فرانس کا ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے کیا۔ اب ان کا شمار ملک کے مسلم لیڈروں میں تھا اور مسلمانوں میں تو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی کہ باید و شاید۔ اب ان کی حیثیت سفیر سے زیادہ مجاہد کی تھی۔ انگلستان خصوصاً شہر لندن میں بہت سی تقریریں کیں، ایسکس ہال، کنگسٹن ہال وغیرہ میں، اور کچھ فرانس میں بھی۔ موضوع تقریر اسلام اور ہندوستان دونوں کی ترجمانی اور پرجوش ترجمانی ہی رہتا تھا۔ تقریروں اور پبلک تحریروں کے انہماک میں ہندوستان خطوط لکھنے کا وقت کہاں سے نکلتے اور جو کچھ لکھے ہیں، ان کی اشاعت کی نوبت اور بھی کم آئی اخبار اس وقت اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، نہ اُردو کا، نہ انگریزی کا۔

پانچویں بار۔ بیمار اور نزار و نزار ایک قدر دان اور جوہر شناس ہندو رئیس کے خرچ پر آخر مئی ۱۹۳۰ء میں اپنے علاج کے لیے یورپ روانہ ہوئے ذیابطیس کا علاج فاقوں کے ذریعہ کرنا تھا اور اس طریق علاج کے ماہرین فرانس میں تھے اس لیے قدرتاً اب کی زیادہ تر قیام فرانس ہی میں رہا۔ اور ڈاکٹروں کی شدید تاکید پر سیاسیات وغیرہ سے ایک بڑی حد تک الگ تھلگ رہنا پڑا۔ اس سفر میں راستہ سے جو مفصل خط لکھا ہے۔ قابل ملاحظہ ہے۔ اقتباس ذرا طویل ہوگا لیکن اس سے ایک طرف تو اس سفر اور چوتھے سفر دونوں کے مقاصد روشنی میں آجائیں گے۔ اور

اور دوسری طرف مولانا کا مجلسی اور معاشری نقطۂ نظر بھی کسی قدر واضح ہو جائے گا۔ خط ولایتی جہاز میسی ٹو ونیا سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ ۶ ر جون ۱۹۲۰ء کی پڑی ہے۔ اور اب جامعہ والوں نے خطوط محمد علی کے مجموعہ میں چھاپ بھی دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

" چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا۔ اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے ترکی سلطنت اور اُس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے۔ گذشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا۔ مگر ؏

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا اس سفر کے بعد تو یہ کر لی تھی کہ اب آستان بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں گے افسوس وہ معاہدہ آج بھی دُور نظر آتا ہے۔ مگر الحمدللہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی۔ آج مسٹر واٹسن پولیٹکل سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے جہاز پر ملاقات ہوئی۔ تو اُنکی اِس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ ٹیبل کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا ہوں محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پہ ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بصرف کثیر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے ہندوستانی عورتیں بھی اس جہاز پر ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں جب سے یہ خط شروع کیا ہے جہاز پر عورتوں اور مردوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ ڈیک پر میرے قریب ہی ایک خوش رو وجیہہ اور بلند قامت فوجی افسر لیٹے رہا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بجے سے میری دیر تک گفتگو رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور اُن کی عمر وغیرہ کے متعلق اُس کے سوالات اور میرے جوابات تھے بڑا ہرا۔ یہ سُن کر اور کچھ دلچسپ پا کر اُن صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے مگر پُر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی۔ جس کے بعد

اُنھوں نے شکریہ ادا کیا۔ اور داد بھی دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بریگیڈیر جنرل ہیں۔

دوسرا خط فرانس کے قیام کے بعد لندن سے ۱۹ اگست کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے طویل اقتباسات بھی نہ لطف سے خالی ہوں گے نہ فائدے سے۔ اس لیے اور بھی کہ اس میں ذکر ایک مشہور بزرگ قوم کی وفات کا ہے جس سے محمد علی سے خاصی چشمک رہ چکی تھی۔ اپنی صحت اور بد پرہیزی کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں :-

" جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کیا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا اُسی وقت سید امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے، اُسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جس دن امیر علی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے۔ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک نہ ہو سکا۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں قبرستان پہونچا، تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھ چکے تھے اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں۔ اور اس شہر خموشاں کا نام بھی Brookwood ہے ریل کی پٹری اس کے اندر تک آئی ہے۔ نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا ہے جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں روشیں چلنے پھرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس شہر خموشاں کے اندر ایک خاصی ریسٹوران بھی موجود تھی، جہاں لنچ کھایا جا سکتا ہے یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں کے لیے بھی ہے یوں تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کر دیا تھا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رُخ کسی قدر غلط تھا۔ لیکن الحمدللہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہونچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے جن میں لارڈ ہیڈلے اور پنجاب کے سابق لفٹننٹ گورنر سر لوئی ڈین بھی تھے۔ سر لوئی ڈین نے مجھے

پہچان کر اُردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت کیا۔ اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمدللہ کہہ کر اور اُن سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے۔ اُن سب کو میں نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ سب سے پُرانی قبر ایک خاتون صفیہ احمد فارسی کی ہے۔"

یہ خط بھی جامعہ کی چھپی ہوئی تازہ کتاب خطوط محمد علی میں درج ہو چکا ہے ۔۔۔ آگے چل کر اسی خط میں بمبئی، حیدرآباد، جہلم، راندیر اور مصر کی متعدد میتوں کی قبروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد توجیوں کی قبروں کی ایک طویل فہرست ہے اس سے کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ کہ محمد علی سیاسیات کے علاوہ بھی انگلستان میں کیا کیا دیکھتے تھے اور کس نظر سے؟

"اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں۔ جو نہ کسی اور سے ہو سکتا ہے نہ کوئی کرتا ہے۔ بااثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں ٹیلیفون پر رات دن باتیں ہوا کرتی ہیں۔ خواہ ٹائمز کا فارن اڈیٹر ہو، خواہ برنارڈشا، وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ یہاں آنے پر اصرار کیا۔ اس طرح گھنٹہ بھر گفتگو کی۔ اور مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ عجیب و غریب ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے آج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسپکیٹر کے اڈیٹر سے دو گھنٹہ باتیں ہوا کیں۔ اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اس طرح ٹائمز کے فارن اڈیٹر سے ۱۰ ½ سے ۱۲ بجے تک ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ خود ہی اس نے ملنے کی خواہش کی۔ سوا گھنٹہ اس سے ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا"

یہ وہ وقت تھا، جب اس محمد علی نے جواب مشرتھانہ مولینا۔ بلکہ صرف دیوانہ: راؤنڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس کے بھرے مجمع میں اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندوستان کا ساحل آخری بار چھوڑتے وقت بھی تو جب ایک مخلص

نے بڑھ کر پوچھا تھا کہ آخر آپ اس حالت میں جا کس لیے رہے ہیں؟ تو دیوانے کی زبان سے بے ساختہ یہی نکلا تھا کہ "مرنے کے لیے" سچ کی بات، اللہ نے سچ بھی کیسی کر دکھائی!

---

(۶)

غالب کا فلسفہ[1]

فلسفہ کا نام سُن کر گھبرائیے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے نامانوس لغات کا ثقیل و مغلق اصطلاحات کا نام نہیں، فلسفہ نام ہے خود شناسی کا، اور زینہ ہے خدا شناسی کا، ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ عادات و اطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے جن سے ہم کو آپ کو سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے، کبھی جان کر، اور کبھی انجانے انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے دیجئے اور لیجئے آپ فلسفی ہو گئے۔ پھر غالب غریب کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری، نظر سطح کی نہیں، عمق کی عادی، چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں، مغز تک پہونچ جانے کی خوگر۔ سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دلآویز نظم میں۔ کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے کبھی نثر کے

---

[1] نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۱۹ر فروری ۱۹۴۲ء کو وقت ۱۵ منٹ۔

مائکروفون کو منہ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہوگئی۔ ورنہ تحقیق کی زبان سے تو روایت تو یہ سننے میں آئی ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے، نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا جب چاہا ہنستوں کو رُلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لُٹا لُٹا دیا، مُرجھائے دلوں کو کِھلا دیا! فطرتِ بشری کے رازدار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سُروں میں الاپتے۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہی ان کی حکمت، یہی اُن کا فلسفہ، یہی ان کی شاعری کا پیام، یہی اُن کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے۔ اور دماغ بیدار، شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے تھے، جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا، آخر تک رہا۔ جوں جوں سن بڑھتا گیا، پختگی آتی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی حقیقتی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ رندی و مستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جاتے ہیں، لیکن اس بیہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں ؎

قطع سفرِ ہستی و آرام فنا ہیچ　　رفتار نفس بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا　　سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی، تیز خیال کی ندرت، طبیعت کی جدت اس نو مشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا طباق سا چاند ہوتا ہے، وہ آخر پیدا ہوتا ہے اسی ننھی، کم رُو اور خیال کی طرح نازک و باریک ہلال سے گو یا کمال کی بنیاد ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے ؎

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال غافلاں نقصان سے پیدا ہو کمال

مذہب کے تشدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے، اور فرقہ بندی کے غلو سے تنگ آ کر کہتے ہیں کہ سکون خاطر منظور ہے تو بس توحید سے لو لگا لیجیے، وحدت کی خانقاہ میں کنج نشین ہو جائیے اور ایک وان، ایک بین، ایک گوبن کر رہ جائیے ؎

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار ہے، اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لیے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ، صنعت و ربوبیت کی کنگھی دست قدرت میں لیے مانگ چوٹی ان کی بھی درست کیے ہوئے ہے اور اُن کی بھی، اس مضمون کو کہیں یوں ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہو ورنہ یاں بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں، یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے، موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں، اور باہر اُسی وقت نکالتے ہیں، جب چوٹ پڑتی ہے، دل پر نہ سہی، کم از کم جسم ہی پر سہی سلسلۂ موجودات میں جس کا جیسا ظرف، ویسا ہی اس کا مرتبہ ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گناہ بیشک، بے حد و بے شمار، لیکن فطرت میں جو قدرت عصیاں میلانِ فسق، طاقتِ گناہ رکھ دی گئی ہے، وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان

گناہ کہاں تک کرے گا، جتنے بھی کرے گا، پھر بھی بہت سے چھوٹ ہی جائیں گے، کرسکتا ہوگا مگر کرے گا نہیں۔ پھر کیا جب وقت جزائے کامل کا آئے گا تو عادل حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کا لحاظ بھی نہ رکھے گی؟ اس مضمون کو کئی کئی طرح ادا کیا ہے، کہیں یوں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے، ہم نے، آپ نے سب نے دیکھا ہے۔ چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا، اور اس کی کرنوں کے ساتھ وہ ساری نمی رخصت، اس منظر پر کبھی کبھی نظر پڑی ہوگی۔ غالب کی نظر اس پر بھی گہری گئی۔ آفتاب کا کام تو زندگی دینا ہے، نشوونما بخشنا ہے۔ بعض قدیم فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے لیکن ادھر کرن پھوٹی، اُدھر شبنم کا وجود بھی رخصت ہوگیا۔ کل نے جزو کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اپنے میں جذب کر لیا۔ ظاہر میں فنا اور دراصل بقا حاصل ہوگئی۔ کہتے ہیں اور فلسفہ وحدت وجود کے اندر گم ہو کر کہتے ہیں کہ یہی حال انسان کا ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اس پر توجہ کرے اس پر تجلی رحمت کا عکس ڈالے اور اسے اپنے اندر جذب کرے ـــــ بندہ کا وجود یوں بھی تو مالک کے سامنے بمنزلہ عدم کے رہتا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور پھر یہی شربت ایک دوسرے گلاس میں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستان کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو سب نے دیکھا، یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کی کرائی

محنت سب دم بھر میں غارت گئی، اور جو غلّہ کا انبار تھا، وہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا لیکن دہقان ہی نے تو آخر دوڑ دھوپ کر کے اس آفت کا محل و مورد تیار کیا تھا اُس آگ کے لیے مسالہ فراہم کیا تھا ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالب پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینیوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور آزادہ مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لَے ہلکی ہے۔ دھیمے سروں میں کہتے ہیں ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ تقبل کا شیفہ حال سے بدل گیا ہے، اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے۔ اس کارو بار حیات کی مثال طلسمات لغو ہے، حقیقۃً معدوم اور صرف بظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا، برکلے نام کا گذرا ہے، وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی!

اور پھر کہتے ہیں اور فلسفہ کی خشکی میں شاعری کی رنگینی پیدا کر کے کہتے ہیں ؎

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون سب سے زیادہ نکلے خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو، حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربے نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت ہی نہیں جب تک انسان اس آب و گل کی دنیا میں ہے، کچھ بھی کرے، ناسوتی جھگڑے بہرحال اس کا ساتھ چھوڑنے کے نہیں، مرزا کی یہ آپ بیتی اُن کی ذاتی نہیں، نوع بشر کی آپ بیتی ہے لیکن شعر کے موزوں سانچے میں لطیف تالب میں ادا تو اُنھیں کی زبان سے ہو رہا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی مفہوم، ردیف و قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور یہ عدم ہستی نما جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے اس کی بھی بساط کیا اور پائیداری کتنی؟ ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہدوں کو دیکھا ہوگا کہ خلق سے اپنے آپ کو گویا بالکل علیحدہ کر لیتے ہیں اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ ماں اور باپ بھائی اور بہن، ہمسایہ اور ہم وطن کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ غالب کی اصلاح میں اس کا نام "وحشت" ہے اور اُن کا فرمانا ہے کہ اس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے نہ کہ دوسرے ؎

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

حسد کا علاج اکثر حکمائے اخلاق نے لکھا ہے۔ مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے۔ اور اس لیے ان کے مطب میں اس کا علاج نظر کی وسعت ہے ؎

حسد سے دل ہو گر افسردہ سرگرمِ تماشا ہو کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مذہب اور اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں، عارفوں کے نزدیک

اخلاص ہے، غالب بھی اسی مشرب کے پیرو ہیں، ان کی شریعت شعری کا فتویٰ ہے کہ منصور کا
بجائے خود قابل صد قدر و مستحق ہزار داد ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے — مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بعض اہل باطن کا قول ہے کہ حکمت کاملہ کو منظور رہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں حد دو کو
توڑ دے تو اب بندہ کا اس سے جھجکنا اور رُکے رہنا، خود ایک معصیت اور خود بینی ہے
یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سنیے ؎

جب کرم رخصتِ گستاخی و بے باکی دے — کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش و موثر انداز میں ؎

کررہا ہوں میں اُسے نامۂ اعمال میں نقل — کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نامحدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے
ہیں اور جو مطلق ہے، اُسے کوئی مقید، اپنی عقل و فہم کی گرفت میں کب لا سکتا ہے؟ عنایت
ہر ایک کی بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے اور
ذرا دیکھئے کس شاعرانہ بانک پن سے اُسے اپنے انداز میں دہرایا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ذات کے طالب کو بھلا تجلی صفات سے کب تسلی ہو سکتی ہے؟ غالب صوفیوں
کی بتائی ہوئی، عارفوں کی بھائی ہوئی اس حقیقت کو دہراتے ہیں، اور بیان میں
شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں، شاید اس لیے کہ سننے والے کہیں بھول نہ
جائیں کہ غالب خانقاہ کے بوریے پر نہیں، مشاعرہ کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

عبرت کا رنگ کلام میں ہمیشہ موجود تھا، سن بڑھتا گیا اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر
ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا۔ سرتاسر مرقع، مدۃ العمر کے تجربات کا نچوڑ سارے

فلسفۂ حیات کا خلاصہ، رُوداد زندگانی کا لب لباب ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　　زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　　میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی　　　مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

نظم کیا ہے، گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے۔ اس قطعہ کا زمانہ، صاحب غالب نامہ کی تحقیق ہے کہ سنہ ۱۸۲۲ء ہے گویا غالب کی عمر اس وقت کل ۲۰ سال کی تھی، اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیے کہ غالب عین جوانی ہی میں بوڑھوں کے ہم سن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط، عبرت اور فنا کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔ ۱۹ر جون ۱۸۶۲ء کو اپنی وفات سے کوئی چھ سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں، کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، یہ جو کچھ لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے ؎

خرم آن روز کزیں منزلِ ویراں بروم"

منزل ویراں کی بربادی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین سال قبل نومبر ۱۸۶۵ء میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جسے دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا، اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں، لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ

لاموثر فی الوجود الا اللہ"

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں: "نجات کا طالب غالب"؛ "مرگ ناگاہ کا طالب غالب"

اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:-

"زندہ ہوں مُردہ نہیں، بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا اُمیدوار، غالب"۔

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا۔ زبانوں پر آج تک چڑھا ہوا ہے، اور معنی خدا معلوم کیا کیا لیے جارہے ہیں؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت غالب
دل کے خوش رکھنے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

اُردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی، اور اُس غزل کا مطلع آپ نے ابھی سُن لیا ہے۔ اب مقطع بھی سُن کر فاتحہ خیر کے لیے ہاتھ اُٹھا دیجئے۔ حالی کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

”شکوہ“ ”جوابِ شکوہ“[1]

جو زبان خوگر تھی حمد و ثنا، شکر و مناجات کی، وہ ایک بار گلہ و شکوہ پر کھلی، کھلی نہیں کھلوائی گئی ـــــ آقا کا کرم جب خود نازبرداری پر آمادہ ہو جائے، تو کون بندہ ہے، جو نیاز کے فرش کو چھوڑ، ناز کی فضا میں نہ اڑنے لگے؟

جب کرم رخصتِ گستاخی و بیباکی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں کہ گریۂ یعقوبی کے ساتھ ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانی کی بھی تو آتی ہے۔

اقبال ـــــ شاعر اس وقت تک شاعرِ اسلام بن چکا تھا ـــ اقبال کے شکوہ میں بندہ گویا روٹھ کر کہتا ہے اپنے خالق و پروردگار سے، کہ واہ لطف و نوازش کی یہ بارشیں بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر، اور ہم اہلِ توحید

---

[1] نشریہ بسلسلۂ یوم اقبال، دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء وقت ۵ منٹ

کا یہ حال زار! یہی صلہ ہے ہماری وفاکیشی کا، یہی انعام ہے ہماری توحید پرستی کا؟

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی ۔۔۔ اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی ۔۔۔ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

شکوہ صرف نام ہی کا شکوہ ہے۔ مضمون وہی، صرف لفافہ بدلا ہوا، ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی، ہر گلہ میں توحید پرستی کی شیرینی! اقبال کی شہرت وعظمت کا سنگِ بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا، خوب چمکا، خوب پھیلا۔ بعض کچھ سمجھے نہ سمجھے۔ بعض مطلب بالکل اُلٹا سمجھے۔ مزہ سب کو آ کر رہا۔

حکیم ملت، ملت کا نباض تھا۔ بھانپ گیا کہ آبِ حیات، صراحیوں اور گلاسوں تک پہونچتے پہونچتے زہر کے بوند بن گیا! مٹا پلٹا شکوہ کے جواب میں، جواب شکوہ تیار کردیا! زور وہی، جوش وہی، چہرہ وہی، تیور وہی۔ البتہ اب کی حکمت و موعظت کی آمیزش اور زائد، حقیقتیں کھلی ہوئی، صداقتیں فاش و برملا۔ جواب کا حاصل یہ کہ "دعوے تو مسلموں کے، اور عہد و پیمان تو، توحیدیوں کے ساتھ تھے۔ تم ہو بھی کہیں مسلم و موحد؟ نام اور لیبل نہیں، نامۂ اعمال پیش کرو، گواہ قال کو نہیں، حال کو لاؤ۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو ۔۔۔ پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے ۔۔۔ تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی شکوہ میں زیادہ پاتے ہیں، اسی کو سینہ سے چپٹائے چلے آتے ہیں۔ جواب شکوہ کی سطح ذرا اونچی ہے۔ ایسی چیز بھلا کب مقبول و عام پسند ہو سکتی ہے؟ شکوہ والا اقبال صاحب حال ہے، سالک ہے۔ جواب شکوہ والا اقبال صاحب مقام ہے، عارف ہے۔ ایک کے قدم اقلیم قلب کی وادیوں میں، دوسرے کی نگاہیں فضائے روح کی بلندیوں میں!

آدمی نامہ[1]

آدمی، سچ کہا جس نے کہا، خلاصۂ کائنات ہے۔ بڑھنے پر، اُٹھنے پر، سنورنے پر آئے، تو فرشتوں سے بازی لے جائے۔ اور گھٹنے پر، بگڑنے پر اترے تو شیطان بھی اس سے نیچا دیکھ جائے۔ مذہب کی اسی بتائی ہوئی اور اخلاق کی اسی سمجھائی ہوئی بات کو نظیر اکبرآبادی نے آدمی نامہ میں ادا کیا ہے، شعر کی زبان سے، شاعری کی آن بان سے، شاعری کے ساز وسامان سے۔

نظم کچھ ایسی بڑی نہیں۔ مخمس کے کل سترہ ہی تو بند ہیں اور اب تو مخمس کا رواج ہی اُٹھ گیا۔ نظیر کے زمانہ میں یہ شعر وسخن کی بڑی کارآمد چیز تھی۔ ہر بند میں کئی نظیریں آس پاس کی لاکر، سب کی نظیر دکھا کر بتایا ہے کہ آدمی یہ بھی ہے، وہ بھی۔ بلندی، پستی، نیرنگی کے بے شمار امکانات اس کے اندر موجود۔ کہتے ہیں ؎

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور — یاں آدمی ہی پاس ہو اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن وقبح میں ہے یاں ظہور — شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہو مکروزُور

[1] نشریہ یوم نظیر کے سلسلہ میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۲۰ جون ۱۹۴۲ء کو وقت ۵ منٹ

اور بادی رہنا ہے، سو وہ بھی ہے آدمی

بات بات میں نصیحت، اور افسانہ، حکایت، کہانی کے پردے میں اخلاق کا سبق مشرق کا پرانا دستور ہے۔ اور اُردو میں نظیر کے شعر میں، اس کا پورا ظہور ہے۔ زبان عام فہم، خیال پاکیزہ، نظیر کی اور بہت سی نظموں کی طرح آدمی نامہ کی بھی خصوصیت ہے۔ زبان بیسوی صدی عیسوی کے وسط میں اُنیسویں صدی کی ابتدا کی، ذرا پرانی اور نامانوس تو ضرور ہو گئی ہے۔ لیکن اس میں شاعر غریب کا کیا قصور؟ وقت کی رفتار اور اس کے لازمی اثرات کو کون روک سکا ہے؟

بہر حال آدمی نامہ لکھ کر اس مرد آدمی نے حق ادا کر دیا۔ اپنے آدم زاد ہونے کا ادر سفتور ہی کردی آدم کے پھیلے ہوئے سارے نسل و خاندان کی!

انسانی برادری کا سبق، آدمیت کی تعلیم، ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ کی تفسیر اس سے بڑھ کر اردو ادب میں اور کہاں ملے گی!

۹

نظیر کی دلچسپی عام چیزوں میں[1]

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

شعر ہے تو اکبر الہ آبادی کا، لیکن اپنے سے ایک صدی قبل کے بیش رو نظیر اکبر آبادی کے حال کا آئینہ۔ ان کے کلام پر بہترین تبصرہ، اور ان کی شخصیت کا صحیح ترین اسکیچ یا خاکہ، آگرہ کا پرانا نام اکبر آباد ہے۔ میاں نظیر، اپنے رنگ میں فرد و بے نظیر، آج سے سوا سو، ڈیڑھ سو برس پہلے باشندہ تھے اسی ملک ہندوستان کے اور رہنے والے اسی شہر اکبر آباد کے شاعری میں اپنی مثال آپ، اور انسان جیسے ہم آپ۔ اسی آسمان کے نیچے سوتے اور اسی زمین پر چلتے، جو کچھ خود دیکھتے اوروں کو بھی دکھاتے۔ جو کچھ خود سنتے اوروں کو سناتے ـــــــ دکھانا، اور سنانا، کیسا؟

اس سے تو نکلتا ہے کہ شاید طبیعت پر زور زور دے دے کر کچھ کہتے ہوں۔ جی نہیں۔ یہ کہئے کہ قدرت کی رنگا رنگی کو دیکھ کر، کبھی ہنستے اور مسکراتے، کبھی رو تے

---

[1] نشریہ یوم نظیر کے سلسلہ میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۳۰ جون ۱۹۴۲ء کو وقت ۱۰ منٹ

اور بلکتے کبھی خوش ہوتے اور کبھی غمگین۔ اور اسی عالم میں کبھی کبھی گنگنانے بھی لگتے۔
بس یہی ان کی شاعری ہے اور یہی ان کی ساحری ہے۔ وہ شعر سنانے کے لیے نہیں،
بلکہ کہنے ہی کی خاطر کہتے۔ اس مقام کی شرح حضرتِ اکبر کی زبان سے سنئے ؎

نہ ان کے لیے ہیں نہ اُن کے لیے — نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لیے
بہت خوب ہے قولِ ادیِ عزیز — کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے

انگریز فلسفی مِل نے بھی تو کچھ ایسا ہی کہا ہے:

RHETORIC IS HEARD POETRY IS OVER HEARD

خطابت دوسروں کے لیے ہوتی ہے اور شاعری اپنے لیے۔ وہ سنائی جاتی ہے، اور
یہ سُن لی جاتی ہے۔

وہ شاعر ہی کیا جس کی نظر صرف خاص پر ہو، عام پر نہ ہو۔ بڑی چیزوں کو تو
وہ دیکھے، اور چھوٹی چیزوں کی طرف سے اپنے کو نابینا کر لے۔ سعدی نے کانٹوں ہی
سے کیسے کیسے گلدستے تیار کر دیئے۔ اور مولانائے روم (صاحبِ مثنوی) گھونگھوں اور
سیپیوں سے کیسے کیسے موتی برآمد کر لائے۔ آبدار اور تابدار! اور تو اور خود قرآن
نے مکھی اور مچھر اور مکڑی کے نام لے کر سبق کیسے کیسے دیئے ہیں۔ یہ تو محض عامیوں
اور سطحی دماغ والوں کا عقیدہ ہے کہ نتیجہ اہم ہو اور وزن و رس نکالنے کے لیے پہلے نام
بھی کچھ بڑے بڑے لے لینا چاہیئے۔ بچپن ہر شخص پر آتا ہے، اور طوفان کی تیزی
کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ نظیر اپنے اس دور کو بڑھاپے میں کیا یاد رکھتے ہیں ؎

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چٹوکرے — ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے

بچپن کی بے فکریوں، آزادیوں، غیر ذمہ داریوں کے سماں ایک ایک کر کے اُن کی
نظر میں ہیں ؎

نے دوستی کسی سے، دل میں نہ اُن کے کینا — جانیں نہ بے قرینا نے سمجھیں کچھ قرینا

نے گرمیوں سے واقف نے جاتے پسینا چھاتی سے ماں کے لپٹے خوش اُنگو دودھ پینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کس حسرت پر آکر اس یاد کی آخری تان ٹوٹتے ہیں ؎

کیا عجب ہے عزیزو اور کیا وقت ہے گا جب گھٹنوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا
پاؤں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا سب زندگی کا حظ ہے ان کو نظیر ؔ بابا

برسات کے چھینٹوں سے سب ہی کھیلے ہیں لیکن نظیر کے آئینہ پر یہی نقش آکر مستقل تصویر کی طرح جم جاتے ہیں۔ مکانوں کے گرنے، انسانوں کے گرنے، سب کے گرنے گرانے کا نقشہ، برسات کی شدت میں کس خوبی سے کھینچا ہے ؎

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آگے جھڑ لگا سنیئے جدھر اُدھر کو دھڑاکے کی ہے صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا کوئی کہے ہے ہائے کہوں میں بتاؤں کیا
تم ذرا کو چھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا

کوچہ میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستہ کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا اُس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ گیا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

نظیر زبان بھی وہی بولتے ہیں جو ان کے ارد گرد بولی جاتی ہے۔ تصنع، آورد ٹھونس ٹھانس ان کے بیان میں نہیں۔ بناوٹ، تکلف، اغلاق ان کی زبان میں نہیں وہ وہی بولتے ہیں جو سنتے رہتے ہیں، وہی لکھتے ہیں جو پڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو غلطیاں ان کے زمانے میں بھی ہوتی تھیں، وہ بے تکلف اُن کی زبان پر بھی چڑھی ہوئی۔ نہ ان کا کلام کسی طرح فرہنگ کا محتاج، نہ اُن کی زبان کے سمجھنے کے لیے لغت کی ورق گردانی کی احتیاج۔ یہ اور بات ہے کہ اب وہ زبان ہی پرانی ہوگئی۔ بہت سے لفظ متروک ہو گئے، ٹک، کسو، بیچ (میں کے معنی ہیں)

کیوں کہ (کیونکر کے معنی میں) وغیرہ۔ اور بعض کے تلفظ بدل گئے۔ مثلاً "ادپر" اُس وقت "اُپّر" تھا۔ "تمیں" اُس وقت "تین" تھا۔ اِدھر اُس وقت "ایدھر" تھا۔ "خواب" اُس وقت "خاب" تھا۔

آرٹ (صنعت گری) کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ نیچر (فطرت یا طبیعت) کی بالکل ضد ہے۔ یہ تعریف اگر صحیح ہے تو نظیر قطعاً آرٹسٹ نہ تھے۔ اُن کا آرٹ تو تمامتر نیچر ہی کی نقاشی ہے، نیچر ہی کی نقالی ہے۔ اور اس معنی میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ نظیر اپنے زمانہ کے بہت بڑے "نیچری" تھے وہ تخیل کے نہیں، دید کے قائل تھے۔ اُن کے ہاتھ میں مصور کا قلم اور کونچی نہ تھی، پہلو میں فوٹو گرافر کا کیمرا لٹک رہا تھا!

خیال نہ گزرے کہ نظیر صرف واقعاتی شاعر تھے۔ وہ نصیحت کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ نیکی کی طرف بلانے کے فن سے خوب آگاہ تھے، کبھی آپ بیتی سُنا کر کبھی جگ بیتی کے راگ گا کر۔ ایک بڑی حد تک اُستاد سعدی کے رنگ میں ہیں۔ رنگِ قبول بھی کچھ سعدی ہی کا سا حاصل ہوا۔ سعدی کی کتابیں صدیوں تک لڑکوں کے درس میں داخل رہیں۔ نظیر کی نظمیں بھی بیسوں برس تک فقیروں نے گائیں۔ قلندروں کے گلے سے صدائیں بن بن کر نکلیں اور کلام کا خدا معلوم کتنا حصہ اس وقت بھی لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا، اور گویا، ادبِ اُردو کا ایک مستقل حصہ بنا ہوا ہے۔ غزل کا ایک شعر فراقیہ مضمون کا ضرور آپ نے سنا ہوگا ؎

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ چلا ہوا شعر میاں نظیر ہی کا ہے۔

یہ بیت بھی خوب چلی ہوئی ہے ؎

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اور وہ بنجارہ نامہ والی مشہور نظم تو بیشتر لڑکوں کے درس میں شامل رہ چکی ہے اور کتنوں کو اب بھی زبانی یاد ہوگی وہی جس کا مشہور مصرع ہے ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

موت اور آخرت کی یاد دلانے اور عبرت اور دنیا کی بے ثباتی کا مضمون پیدا کرنے کے نظیر بادشاہ ہیں۔ کلیات میں دو ایک نہیں بیسیوں نظمیں نام اور عنوان بدل بدل کر اسی ایک مفہوم سے متعلق ملیں گی۔ حمد الٰہی، تمنا و بقا، تنبیہ غافلان، انعام، خدا مکاں دنیا سب اسی قسم کی نظموں کے عنوان ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف قصۂ ہنس سنتے چلیے۔

آیا تھا کسی شہر سے ایک ہنس بچارا — ایک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اُس کا گزارا
رہتے تھے بہت جانور اُس پیڑ کے اوپر — اُس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا
دیکھا جو طیوروں نے اُسے حسن میں خوش رنگ — وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا
باز و لگڑ و جرّہ و شاہیں ہوئے عاشق — شکروں نے بھی شکر سے کیا اس کا مدارا
زاغ و زغن و طوطی و طاؤس و کبوتر — سب کرنے لگے اس کی محبت کا اشارا
جتنے غرض اُس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے — اور ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

کچھ روز کے قیام کے بعد ہنس کے کوچ کی گھڑی آگئی ع

اِک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

لو یارو اب ہم جائیں گے کل اپنے وطن کو — اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمھارا

جانورستان بھر میں اس سے کھلبلی مچ گئی ہے

اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک کے اُڑے ہوش — سب بولے یہ فرقت نہیں ہم کو گوارا
ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمھارے ہی چلیں گے — یہ درد تو اب ہم سے نہ جائے گا سہارا

صبح نمودار ہوئی، اور "پر اپنا ہوا پر وہیں اُس ہنس نے مارا" ہ

سب ساتھ چلے اُس کے وہ ہمراز وہوا خواہ　　ہر ایک نے اڑنے کے لیے پنکھ پسارا
دو کوس اُڑے تھے کہ ہوئی ماندگی غالب　　پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت دیارا
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ　　آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

اس قسم کی دلچسپ نصیحت آمیز شاعری مشرق میں "آرٹ" کا ایک جزو سمجھی گئی ہے۔ اور نظیر اس معیار پر پورے اور بہتوں سے کہیں زیادہ پورے اُترے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سادگی اور فطرت سے مطابقت اگر ایک طرف ان کی شاعری کا غازۂ جمال ہے تو دوسری طرف ان کی انسانیت اور شخصیت کا عنوان کمال!

۱۰
اکبر الہ آبادی[1]

ایک مختصر سی، لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ، لکھنؤ میں آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے۔ طرح کی زمین ہے "ازل سے" "کل سے" ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ؎

اُلجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے   مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں، کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا۔ اور اس شعر پر تو محفل لوٹ گئی ؎

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی   ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے اور شراب سے اسے تشبیہ بار ہا دی جا چکی ہے حافظ کی غزل تک اس کا رتبہ پہنچا دینا یہ اسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ ہے اور عجب کیا جو خود خواجہ حافظ کی روح بھی یہ اچھوتی داد سن کر وجد میں آگئی ہو۔ اور جب اس شعر کی نوبت آئی ؎

---

[1] نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۹ ستمبر ۱۹۴۲ء کو۔ وقت ۱۰ منٹ

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

اور مقابعد اس شعر کی ؎

درجہ تحیر کا ہے بیخود سے فرد تر ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

تو جو اہل دل تھے ان کی آنکھوں میں کچھ بوندیں جھلک آئیں اور اہل معرفت کی زبان پر بے ساختہ مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے جاری ہو گئے ــــ لیکن شاعر نے جب اسی غزل کے ایک شعر کا یہ مصرعہ پڑھا کہ ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے گہرے مذہبی شخص، خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم موجود تھے، اُن کے تیور پر کچھ بل سے پڑنے لگے کہ لیجئے مذہب سے بھی شوخی ہونے لگی! حساس شاعر تاڑ گیا، اور جھٹ پہلے مصرعہ کو مکرر پڑھا اور پورا شعر یوں سنایا ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے کس حسن سے، یہ بھی تو سنو حسن عمل سے!

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی، اور خان بہادر نے تو بے اختیار اُٹھ کر شاعر کو گلے لگا لیا! ان شاعر صاحب کو آپ نے پہچانا؟ یہی تھے سید اکبر حسین اکبر۔ اُس وقت غالباً منصفی کے عہدہ پر تھے۔ آگے چل کر خفیفہ کے جج اور پھر سشن جج ہوئے، جو اس زمانہ کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی گویا ترقی کی معراج تھی۔ خان بہادر ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہوئے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیات کے تین جلدوں کے مصنف، اپنے وقت کے ایک نامور ترین شاعر ہوئے، اپنے رنگ میں فرد۔ برجستگی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ ایک نمونہ تو ابھی آپ سُن ہی چکے ہیں، اور معنی آفرینی گویا اُن کا حصہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھے اُن کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جب جس مضمون کو چاہا، بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت، ہم کو آپ کو کچھ نہ کچھ وقت لینا ہی پڑتا ہے۔

انھیں شعر کہتے اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ اس نیاز مند کو مرحوم کی عمر کے آخری نو دس سال ذاتی نیاز مندی اور حضوری کا اچھا خاصا اتفاق رہا۔ یہ بات اسی تجربہ کی بنا پر عرض کی جا رہی ہے۔ حضرت اکبر بوڑھے ہو چکے تھے۔ عمر ۶۴، ۶۵ سے زاید ہو چکی تھی۔ ذہانت، شوخی، برجستگی، معنی آفرینی، لطافتِ زبان، حسنِ بیان یہ سب اوصاف اُس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے، اور بعض دفعہ بے بات کی بھی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود ہنستے بہت کم تھے۔ دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ رہتے۔ اور ہنساتے ہنساتے کبھی رلانے بھی لگتے۔ کوئی چوٹ ایسی دل پر لگا دیتے، کہ سننے والے کا دل درد سے بھر آتا! ـــــ راگوں میں سُنا ہے کہ کوئی دیپک راگ بھی تو ہوتا ہے، جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے!

پُر گوئی گویا ان پر ختم تھی۔ تین کلیات تو صرف چھپے ہوئے ہیں۔ باقی جو حصہ چھپنے سے رہ گیا ہے، وہ بھی ایک کلیات یا ڈیڑھ کلیات سے کم نہیں، اور وہ شعر جو اکبر سخن گو نے کہے اور اکبر سخن سنج کو چھپنے کے قابل نظر نہ آئے، اُن کی تعداد اُن کے علاوہ!! اصل ناموری غزل گوئی میں نہیں، نظم گوئی میں پائی۔ بلکہ اس کی بھی ایک خاص صنف یعنی ظرافت میں۔ لیکن غزلیں بھی جناب اکبر کی کسی سے کم نہیں۔ کم نہ تعداد و حجم کے لحاظ سے اور نہ حسن و معنویت کے اعتبار سے ـــــ امتحان کی مہلت میں اتنی گنجائش ہی کہاں۔ ورنہ اکبر کے عاشقانہ کلام کے کثرت سے نمونے پیش کر کر کے فیصلہ خود آپ ہی کے ذوقِ سلیم پر چھوڑ دیا جاتا۔ اکبر مذہب کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرفداروں میں تھے۔ اور یہ یاد رہے کہ یہ وہ وقت تھا جب "رفارم" یا اصلاح و تجدد کا جھنڈا سید احمد خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر اُن کے معاصر تھے، گو سن میں اُن سے کہیں چھوٹے۔ اور علیگڈھ میں خود منصف

...رہ کر "فارم" یا تجدد کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ کلام میں خوب خوب چٹکیاں لیتے جاتے ہیں، لیکن، چٹکیاں بھی عموماً گدگدیوں ہی کے رنگ کی ہوتی ہیں ـــــ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات   افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے وہ مجھ سے "دین کی اصلاح فرض ہے"   میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

کہیں کہیں یہ ظرافت ہلکی سی نشتریت بھی پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے یہ شعر ؎

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے   شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

گزٹ کے معنی سرکاری گزٹ کے تو بالکل ظاہر ہیں۔ تلمیح یہ ہے کہ سرسید کے ہفتہ وار اخبار کا نام بھی علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا۔ یہ شعر ایک غزل کا ہے، اور غزل کا مطلع ہے ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا   بُت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

یہاں تک جب آپ آ گئے ہیں، تو ایک آدھ شعر اور بھی اسی غزل کے ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے ؎

گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش   طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا
بزم یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس   ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا

اور ایک شعر مخصوص اکبری رنگ کا ؎

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے   کر دیا کعبہ کو گُم اور کلیسا نہ ملا

سیاسیات میں اکبر کا مذاق وہی تھا، جو ہر خوددار مشرقی کا ہونا چاہئے۔ لیکن یہ میدان کے سپاہی اور اکھاڑے کے ڈنڑ پیل پہلوان نہ تھے۔ مجلس ادب کے مسند نشین اور بزم ظرافت کے میر تھے۔ زبان کھولتے تو میٹھے میٹھے بولوں میں ایک پھلجھڑی چھوڑ جاتے۔ ہنسی کی کھلکھلاہٹ سننے والوں کی پیشانیوں پر شکن قائم ہی کب رہنے دیتی۔

ایک رباعی کے پہلے مصرعہ میں فرماتے ہیں،

" انگریز ہر ایک فن میں ممتاز بھی ہیں"

دوسرے مصرعہ کے کچھ لفظ بھول رہا ہوں "دمساز بھی ہیں" کچھ اس طرح باندھا تھا خیر جانے دیجئے[1]۔ کام کے مصرعے آخر کے دو ہیں ؎

بابو کو نچا دیا جو چابی دے کر
اس سے یہ کھلا کہ دل لگی باز بھی ہیں

"بابو" کیا خوب! ایک طرف بنگالی بابو بلکہ کل انگریزی داں ہندوستانی اور دوسری طرف دوکانوں پر بکنے والے چینی کے کھلونے، کوک سے ناچنے والے! ــــــ اور چابی کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں "کھلا" کیا خوب! کیا خوب! اس چابی سے "کھول لینے" پر تو شاید لکھنؤ کے بڑے بڑے اُستاد بھی "بند" ہو جائیں!

اکبر ذاتی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہر بڑے چھوٹے سے جھک کر ملنے والے کسی کی دل شکنی نہ گوارا کرنے والے۔ اور نماز و قرآن کے گویا عاشق، ایسا عشق جو اچھے اچھے عالموں، درویشوں میں بھی کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ آج ۹ ستمبر کو اُن کی بیسویں برسی ہے۔ فاتحہ خیر پر اس ذکر خیر کو ختم کیجیے۔

---

[1] بعد کو پروفیسر نسیم الرحمٰن صاحب ایم۔ اے (الہ آباد یونیورسٹی) کی عنایت سے یہ دونوں صحیح مصرع بھی معلوم ہو گئے ؎

انگریز قومی بھی ہیں سرفراز بھی ہیں — تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں

(۱۱)

دِلم در عاشقی آوارہ شُد[1]

مصرعہ جو ابھی آپ کو سُنایا گیا، آپ نے سُن لیا؟ ایک بار پھر عرض ہے ؎

دِلم در عاشقی آوارہ شُد آوارہ تر بادا!

شاعر کس حسرت سے کہہ رہا ہے کہ میرا دل غمِ عشق میں مبتلا ہو چکا، اس میں حیرانی پریشانی پھر رہا ہے، اس پر بھی جی یہ نہیں چاہتا کہ یہ غم ختم ہو جائے، اور اس آزار سے رہائی حاصل ہو جائے۔ بلکہ اس کے برعکس آرزو ہے تو یہ، کہ یہ آوارگی، غم اور بڑھے اور روز جتنا اب گھٹ رہا ہے، اس سے اور زیادہ گھٹے ــــــ اللہ اللہ محبت کا درد بھی کتنا لذیذ درد ہوتا ہے!

اور دوسرے مصرعہ میں تکملۂ آرزو کرتا ہے کہ ؎

تنم از بے دلی بے چارہ شُد بیچارہ تر بادا

دل کے طفیل جسم بھی تو خستگی و ناتوانی کا شکار ہو چکا ہے، کاش یہ خستگی و ناتوانی بھی اور بڑھے، اور عشق کے جبر کے اُٹھانے اور غم کھانے میں جسم کا قدم دل سے پیچھے نہ رہنے پائے!

---

[1] نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۹ رنومبر ۱۹۳۷ء کو وقت ۱۰ منٹ

شعر ہم نے آپ نے سب نے سُن رکھا ہے کہ امیر خسروؒ دہلوی کا ہے۔ اور امیر خسروؒ کا نام آتے ہی ذہن کے سامنے تصویر ایک بزرگ درویش پیر مرد کی آجاتی ہے۔۔۔ تصویر درویشی اور بزرگی کی حد تک تو ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن کبرسنی کے پہلو سے تو قطعی غلط ہے۔ امیر کی یہ غزل اُن کے پہلے دیوان میں درج ہے، جس کا نام "تحفۃ الصغر" یا "کمسنی کا تحفہ" ہے۔ اور اس کے دیباچہ میں اُن کے اپنے قلم سے تصریح موجود ہے کہ اُس کے اندر صرف ۱۶ سال سے لے کر ۱۹ سال کی عمر تک کا کلام ہے!۔۔۔۔۔ تو گویا جس نے یہ چبھتا ہوا مطلع کہا اور درد عاشقی کی تصویر کھینچ دی، وہ ایک نوجوان لڑکا نکلا، زیادہ سے زیادہ ۱۹ سال کی عمر والا، اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی سال دو سال کم ہی کا! کمال ہے کہ کلام میں یہ پختگی اور سِن کل اتنا!

مطلع پر حیرت ختم ہو چکی ہو، تو آگے بڑھئے۔ غزل کی غزل ایک رنگ میں ہے ؎

بہ تاراج اسیران زلف تو عیارہ می دارد
بہ خونریز غریبان چشم تو عیارہ تر بادا
رُخت تازست بہر مُردن خود تازہ تر خواہم
دلت خارست بہر کشتن من خارہ تر بادا

معنوی حیثیت سے مضمون کا تسلسل قائم ہے، اور ساتھ ہی زمزمے سب دہی آرہے ہیں۔ اور پھر اسیروں کے لئے "زلف" کی لفظی مناسبت اور "رخ" اور "دل" کا تقابل غرض منتیں بھی اُستادانہ الفاظ و معنی دونوں کی پختگی کے اعتبار سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام کسی نوجوان صاحب زادہ کا ہے؟

غزل میں مسلسل مضمون شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ غزل کا جو عام دستور فارسی میں چلا ہوا ہے (اور دہیں سے اُردو میں آیا ہے) وہ تو یہ ہے کہ ہر شعر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر شعر کا مضمون دوسرے سے الگ۔ غزل مسلسل کمتر ہی کوئی کہتا ہے۔ یہ صاحبزادے

مستند اُستاد تو بہت بعد کو تسلیم کئے گئے، لیکن اُستادی کی یہ جھلک شروع ہی سے رکھتے تھے، کہ تسلسلِ مضمون پر اُسی وقت سے قادر تھے!

چوتھا شعر، جانِ غزل یہی شعر ہے، ملاحظہ ہو

گرا ے زاہد دعائے خیر میگوئی مرا این گو
کہ این آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

معلوم ہوتا ہے شاعرِ آشفتہ سر، عشق پیشہ کو کسی زاہد بزرگ نے کہیں دیکھ پایا ہے، اور اس کی آشفتہ حالی پر ترس کھا کر اُس کی فلاح و اصلاح کے لیے دعا کرنا چاہتا ہے، اور دعا اندرونۂ یہی ہوتی کہ اس بیچارہ کو عشق سے نجات حاصل ہو۔ شاعر یہ صورتِ حال بھانپ جاتا ہے۔ حضرتِ زاہد کی عظمتِ زہد سے اُسے بھی انکار نہیں جانتا ہے کہ اُس کی دعا قبول ہو کر رہے گی۔ قبل اس کے کہ زاہد کے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھیں، شاعر کی زبان چل اُٹھتی ہے اور یہ عرض کرنے لگتا ہے کہ "حضرت خدا کے لیے کوئی اور دُعا نہ کر بیٹھیے گا، دعا یہ فرمایئے کہ آزارِ عشق مجھ خستہ جگر کے لیے اور بڑھتا ہی جائے"۔

دلِ من پارہ گشت از غم نہ زاں گونہ کہ بہ گردد
اگر جاناں بدیں شاد است یارب پارہ تر بادا

میرا دل تو غم سے ٹکڑے ٹکڑے، پاش پاش ہو چکا، جس کے جُڑنے اور درست ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں (نہ زاں گونہ کہ بہ گردد) لیکن محبوب کی مرضی اگر یہی ہے، اگر وہ اسی میں خوش ہے، تو اے پروردگار یہ اور زیادہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر، اور اس سے زیادہ پاش پاش ہو کر رہے!

چھٹا شعر پھر اسی تمنا کا ترجمان ہے

ہمہ گویند کز خونخوارِ یش خلقے بجاں آمد من ایں گویم کہ بہر جانِ من خونخوارہ تر بادا

لوگ کہتے ہیں کہ محبوب کی سفاکی سے خلقت جان سے تنگ آگئی ہے، لیکن مجھے تو ارمان اس کا ہے کہ میرے حق میں اس کی سفاکی کچھ اور بڑھ ہی کر رہے!

ساتویں شعر پر پہونچ کر شاعر قلم رکھتا ہے، تو اپنے حق میں یوں دعاگو ہوتا ہوسہ

چہ با تر دامنی خو کرد خسرو باد چشم تر
زآب چشم مژگان دامنش ہموارہ تر بادا

کہ اس غمزدہ کا غم اور ترقی ہی پر رہے۔

سات شعر دیا عشق کی سات منزلیں تھیں، طے ہوئیں، گویا ایک ہفتخوان سر ہوا۔ یا یوں کہئے کہ شاعر کو ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی۔ "سات" کا عدد صوفیہ کے ہاں بڑا مبارک مانا گیا ہے۔ اور اکیلے صوفیہ ہی کے نہیں، مشرقی مذہبوں میں عموماً ـــــ

امیر نے غزلوں پر غزلیں نہیں، دیوان پر دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ غزلوں اور پھر غزل کے شعروں کا کوئی شمار ہی نہیں۔ عشق و محبت وصل و فراق، سوز و گداز کی مصوری خدا معلوم کے ہزار بار کامیابی اور رعنائی کے ساتھ کی۔ اور آخر کو استاد سخن، امام فن کہلائے، اس شاندار انجام کی جڑ سب کو ہے۔ قابل رشک آغاز آج آپ نے دیکھ لیا؟

لیکن اس حیرت انگیز ابتدا کی لم بھی کچھ خیال شریف میں آئی؟ تذکرہ نویسوں کے قلم نے یہ تصریح جو کردی ہے کہ امیر ابھی آٹھ سال کے بچے تھے کہ پدر بزرگوار نے لاکر شیخ وقت، عارف باللہ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر ڈال دیا اور خواجہ کی نظر قبول اُسی وقت پڑ گئی۔ ادھر خود جوہر قابل۔ اتنے بڑے صاحب نسبت سے نسبت کہیں بیکار جا سکتی ہے؟ دن دونی، رات چوگنی ترقی شروع ہوگئی۔ قطرہ کرنیں آجانے سے جگمگا اُٹھا ـــــ خواجہ کا یہ قول بھی تو منقول ہے کہ جب قیامت میں سوال

ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے، تو عرض کر دوں گا کہ خسرو کو! اور مذکروں کی زبان پر یہ روایت بھی تو چڑھی ہوئی ہے کہ حضرت دعا مانگتے تھے تو امیر کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے، کہ" الٰہی اس ترک کے سوز دل کے طفیل میں میری مغفرت کر"!

اس مرتبۂ راز دنیاز اور اس درجۂ اختصاص کے بعد اس میں حیرت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ اس پایہ کا کلام ایک کمسن کی زبان سے ادا ہوا ہے! محض شاعر، ردیف و قافیہ کا استاد ماہر، ان مرتبوں تک پہونچ ہی کب سکتا ہے، یہ تو عشق حقیقی کی روح ہے جو اس قال کو حال بنا دیتی ہے۔ اور الفاظ کے اندر معنویت پیدا کر دیتی ہے! عارف رومیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود عشق نہ بود عاقبت ننگے بود

دنیا والوں اور دنیا والیوں کا عشق بھی کوئی عشق ہے! اگر نا جائز محل پر ہے، جب تو سراپا فسق، لیکن اگر محل جائز پر ہے، جب بھی آب و رنگ، نقش و نگار کی بہار کب تک، حسن و شباب کی طلسم بندی کے دن؟

ہے یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریب آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

یہ قوت تو اسی اور صرف اسی حسن میں ہے، جو زوال و انحطاط، تغیر و فنا کے ہر قانون سے بالاتر ہے۔ ایک بار پھر یہ قول مولانائے رومی ؎

عشق با مردہ نہ باشد پائدار عشق را برحی و بر قیوم دار

بس دل کا لگاؤ شرط ہے، امیر کو عشق اسی محبوب حقیقی سے تھا۔ اور مرشد کامل کے فیض و توجہ سے کہنا چاہئے کہ بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ ساری طلب و تمنا اسی عشق میں زیادتی کی تھی، دل میں بھی اور زبان پر بھی۔ ان کے کوئے بتاں سے مقصود و مُراد شہر کا کوئی بدنام محلہ یا بازار کا کوئی کوچہ فسق نہیں، بلکہ حسن مطلق کی تجلیات گوناگوں

ہیں، انھیں حسین وجمیل تجلیات میں وہ گم ہیں، اور انھیں میں ضم ہو جانے کی دعا اپنے حق میں وہ زاہد سے بھی کرا رہے ہیں،

کہ آں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

رحمت ہو اُن کی پاک رُوح پر۔ بزم سخن میں آمیر بن کر رہے، اور اقلیم تصوف و معرفت میں خسرو بن کر چکے! زبان پر وہ قدرت کہ ایران کے اہل زبان تک ان کی نارسیت کے قائل، اور سلوک و فقر میں وہ مرتبہ کہ جو تذکرۂ صوفیہ و سالکین ان کے نام نامی سے خالی، وہ خود ناقص و ناتمام۔

(۳)

چند مرثیے

(۱)

عبدالرحمٰن کی موت[1]

پہاڑ اور پہاڑی غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگریزوں کی تعداد شمار سے خارج بڑی ہوئی ہوتی ہے، جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انھیں میں کوئی کوئی سنگریزہ لعل و یاقوت بن کر نکل آتا ہے۔ جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے، تو دل پر کیا گزر جائے گی؟ سمندر میں بارش کے بیشمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے۔ لیکن انھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوشِ صدف میں پل کر موتی بنکر نکلتے ہیں اور تاجِ سلطانی کا زیور بنتے ہیں، اُن کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا؟ جنگل میں خود رو پھول اور پتے، درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں۔ جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں۔ لیکن گلاب کی تازہ و شاداب کلی بزمِ ہستی کو معطر کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں

---

[1] ہمیج (لکھنؤ) ۱۹ مارچ ۲۶ء۱۹

کی دست بُرد کی نذر ہو جائے، تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور تابو میں رکھا جا سکتا ہے؟
ایک چراغ جلا لیکن قبل اس کے کہ اس کا اجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا
ایک آفتاب چمکا، لیکن بیشتر اس سے کہ اس کی شعاعیں پورا نور پھیلائیں، غروب ہو گیا۔ ایک پھول کھلا، مگر مرجھا گیا۔ سبزہ لہلہایا مگر نور آ خشک ہو کر زمین کے برابر ہو گیا۔ حق کی پکار بلند ہوئی لیکن فضائے نامتناہی میں گم ہو گئی۔
عبد الرحمٰن بگرامی نے ۲۷-۲۸ سال ہوئے ناسوت کے ظلمت کدہ میں آنکھیں کھولیں لیکن یہاں کی فضا کو شاید اپنے غیر موافق پا کر ۲ مارچ ۱۹۲۶ء (۱۴ شعبان ۱۳۴۴ھ) کو صبح کے وقت مقید مطلق میں، قالب بے قالبی میں، جسد عنصری عالم جان میں پھر جذب و گم ہو گیا۔ سچ کہا ہے سچ کہنے والے نے کہ ہم سب "اسی" کے ہیں اور سب "اسی" کی طرف واپس جانے والے ہیں ؎

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون

آنکھیں اشکبار کہ عالم انسانیت کے اس جوہر آبدار کو اب کہاں تلاش کریں، قلب مضطرب کہ کائنات آب و گل کے اس گوہر بے بہا کے بغیر کیوں آرام پائے۔ عقل حیران کہ گلشن بشری کے اس گل رعنا کو کہاں سے ڈھونڈھ نکالا جائے لیکن غیب کا فرشتہ آواز دیتا ہے کہ اس قید خانۂ عنصری میں صرف اسی وقت تک کے لیے روحوں کو مقید رکھا جاتا ہے، جب تک وہ اپنی تربیت حاصل کر لیں۔ عالم معنی میں زمانہ کا شمار، انسان کی بنائی ہوئی جنتری اور آفتاب کی گردش سے نہیں ہوتا۔ بلکہ روح کے لیے واپسی کا وقت مقرر وہی ہے جب وہ اپنی تربیت کی تکمیل کر لے۔
پس اگر اُس پاک وصف و پاکیزہ سرشت ہستی نے، جس کا ناسوتی نام عبد الرحمٰن تھا اتنی کمسنی ہی میں تکمیل روح کے سارے مدارج طے کر لیے تھے، تو ٹھیک اسی

وقت مقررہ پر اس کا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا لازمی تھا، جس پر حیرت کرنی بیجا اور تاسف کرنا بے محل ہے۔ دنیا کی ظاہر بیں نگاہیں، اس مرنے والے کے خط و خال سے زیادہ مانوس نہ تھیں۔ آج اگر اس مرحوم کے فضائل و کمالات کو پھیلا کر بیان کیا جائے تو شاید بہتوں کو مبالغہ کا شک گذرے گا لیکن جن لوگوں کو خوش نصیبی سے ذاتی نیاز حاصل تھا، وہی بدنصیب اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ایک ذات کے اٹھ جانے سے امت اسلامیہ کیا کھو بیٹھی۔ میں مرحوم کو اس زمانہ سے جانتا تھا جب وہ دار العلوم ندوہ کی شاید کسی نیچی جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر ۱۵، ۱۶ سال سے زیادہ نہ تھی، تقریر کا شوق انہیں اسی وقت سے تھا اور قیصر باغ لکھنؤ میں جب پہلی بار میں نے ان کی تقریر سنی تو تقریر اتنی بلند و برتر تھی کہ قدرتہً بدگمانی یہ پیدا ہوئی کہ کسی نے یہ تقریر قلمبند کر کے پیشتر سے حفظ کرا دی ہے۔ ورنہ اتنا کم سن طالب علم ایسی تقریر برجستہ کر نہیں سکتا، مگر جوں جوں سابقہ بڑھتا گیا، یہ بدگمانی دور ہوتی گئی۔ اور اس آئینہ کے اصلی جوہر کھلتے گئے۔ ندوہ میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک زمانہ تک سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کے مدرستہ الاصلاح میں اتالیقی کے فرائض انجام دیئے۔ مولوی امین احسن اصلاحی جن کے مضامین سچ کی پہلی جلد میں بکثرت شائع ہو چکے ہیں[1]۔ اسی دور کے شاگرد ہیں۔ مدرستہ الاصلاح اپنے رنگ کی سارے ملک میں بہترین تربیت گاہ ہے۔ سادہ ترین معاشرت کے ساتھ اعلیٰ ترین علم و اخلاق سے مسلمانوں کے بچوں کو آراستہ کرنا اس کا مقصد ہے[2] جناب مولانا حمید الدین صاحب مدظلہ العالی (صاحب تفسیر نظم القرآن) اس کے سرپرست و نگران اعلیٰ ہیں[3]۔ اور مرحوم ان کے بہترین رفیق و مددگار تھے۔ چھوٹے چھوٹے یتیم اور بے والی و وارث بچوں کو جس شفقت و محبت کے ساتھ مرحوم تربیت دیتے تھے، اس کا نمونہ

---

[1] یہ وہی صاحب ہیں، جو اب ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر ہیں۔

[2] ظاہر ہے کہ یہ ذکر مدرسہ کے ان خصوصیات کا ہو رہا ہے جو ۱۹۲۶ء میں اس میں موجود تھے۔

میری نظر سے کم گزرا ہے۔

غالباً ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام کی طلب پر مرحوم کلکتہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں اس اسلامی دار العلوم میں جو سرکاری امداد سے بے نیاز رہ کر کھولا گیا تھا، صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ اس کم عمری میں اتنی بڑی ذمہ داری کے عہدہ پر انتخاب ہو جانا اور پھر اس ذمہ داری کو حسن و خوبی انجام دینا مرحوم کی ایک مخصوص فضیلت تھی۔ یہ زمانہ تحریک خلافت و ترک موالات کے شباب کا تھا اور مرحوم نے علاوہ اپنے مشاغل تعلیم و تدریس کے ان اجتماعی و قومی تحریکات میں پوری قوت جوش و سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ بکثرت تقریریں کیں اور متعدد مضامین مسائل حاضرہ پر سپرد قلم فرمائے ۱۹۲۱ء کی آخری سہ ماہی میں مولانا ابوالکلام کی سرپرستی اور مولوی عبدالرزاق خاں ملیح آبادی کی اڈیٹری میں پیغام کے نام سے ایک ہفتہ وار، کلکتہ سے نکلا۔ مرحوم نے اس کے اوراق پر بار ہا ملکی آزادی کے مسئلہ کو شریعت و قرآن پاک کی روشنی میں پیش کیا غالباً شروع ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ مستقل طور پر آ گئے، اور دار العلوم ندوہ نے اپنے ہاں ادب کی خدمت پر انھیں مامور کیا۔ قرآن کا ذوق فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ درس ادب بھی درس قرآن ہی ہوتا تھا۔ ہر شاگرد کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ کر شفقت تھی۔ متعدد شاگردوں کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ دار العلوم ندوہ کی جو اصلی روح تھی، اُسے از سر نو زندہ کر دیا اور بہت سے سینوں میں قرآن کی خدمت اور اسلام کی محبت کا نور پیدا کر دیا۔ لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ کی ہر اصلاحی تحریک میں خلوص قلب کے ساتھ حصہ لیتے رہے، تبلیغ، تنظیم، خلافت، ندوہ، کانگرس، ہر تحریک میں جو امت اسلامیہ کے لیے مفید معلوم ہوئی، بہ قدر استطاعت پوری سرگرمی کے ساتھ شرکت فرمائی۔ لکھنؤ میں ۱۹۲۴ء کے ہندو مسلم فسادات کے موقع پر اور ۱۹۲۵ء میں جونپور کے ہندو مسلمانوں میں صلح کرائی۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ کے اور نومبر ۱۹۲۵ء میں اناؤ کے اجلاس ندوہ میں مقاصد ندوہ پر جو اعلیٰ تقریریں ارشاد کیں وہ

گویا اس وقت بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔ انبالہ والی تقریر غالباً زندگی کی سب سے آخری تقریر تھی۔ علالت اس وقت شروع ہو چکی تھی۔ تقریر بہت دیر تک جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں رفاہ عام لکھنؤ میں توفیق شریف کی عربی تقریر کا جس برجستگی و شستگی کے ساتھ اُردو ترجمہ کیا تھا، اس نے مخالفین تک کو داد دینے پر مجبور کر دیا۔

ہم چند شوریدہ سروں کو ایک اصلاحی پرچہ نکالنے کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی بشتہ ۱۹۲ء کی آخری سہ ماہی میں مولوی ظفر الملک صاحب کی مستعدی سے یہ دشواری ایک بڑی حد تک حل ہو گئی۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۲۲ء کو دفتر سچ میں چار شخصوں کی مجلس میں تمام ابتدائی مراتب طے پا چکے۔ اس مختصر مجلس کے ایک اہم رکن خود مولوی عبدالرحمٰن تھے۔ عام مقاصد سے ہمدردی اور اتفاق رکھنے والے متعدد احباب تھے۔ لیکن یہ اس وقت نظر آ گیا تھا کہ اکثر عقائد و خیالات کے جزئیات تک میں موافقت عبدالرحمٰن کو عبدالماجد کے ساتھ ہے، وہ شاید کسی دوسرے عنایت فرما کو حاصل نہیں اور شرکت تحریر میں جو سہولت، مرحوم کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے، اس کی توقع کسی اور سے نہیں۔ بعد کے تجربہ نے اس توقع کو حرف بحرف صحیح ثابت کر دیا۔ ایک سال سے کچھ اوپر کے طویل سابقہ میں مرحوم کے لہجہ تحریر سے صرف ایک بار (جلد اول ۱۵ میں) ایک مضمون کے عنوان اور اس کے بعض الفاظ سے متعلق مجھے اختلاف ہوا۔ اور جب میں نے اپنی اس رائے کو اُن پر ظاہر کیا تو اُس بے نفسی کے ساتھ جو اُن کے بعد میرے لیے اب خواب و خیال ہے۔ اُنھوں نے بلا تامل بتوقف میری گذارش کو تسلیم فرما لیا۔ سچ میں اپنے مضامین کے ذریعہ سے اسلام و اُمت اسلامیہ کی جو خدمت وہ انجام دیتے رہے، اس کی پوری روداد ناظرین سچ کے سامنے ہے۔

پچھلے چند ماہ سے پیروں کے درد میں مبتلا رہنے لگے۔ جسے ہم لوگ ہلکے وجع مفاصل کے قسم کا کوئی مرض سمجھتے رہے۔ اور چونکہ خود مریض نے اپنے صبر و توکل کی بنا پر کبھی مرض کی شدت نہیں بیان کی۔ اس لیے قدرۃً اسے معمولی اور غیر اہم سمجھا کیے۔ علاج

کا سلسلہ جاری رہا۔ لکھنؤ اور رنگرام (ضلع لکھنؤ) میں متعدد اطبا کے علاج کے بعد بہرائچ ایک عزیز کے ہاں علاج و تبدیل آب و ہوا دونوں کی غرض سے تشریف لے گئے، مسہل ہوئے، افاقہ محسوس ہوا، چنانچہ ان کے آخری مکتوب میں انھیں کے قلم سے افاقہ کی خبر پڑھ کر سچ (نمبر ۱) میں میں نے ان کے متعلق کسی قدر اطمینان بخش نوٹ دیدیا تھا۔ اور ناظرین سے ان کی صحت کے لیے دعا چاہی تھی۔ عین اسی روز جبکہ وہ نوٹ طبع ہوا، اسی صبح کو نماز فجر کے قریب بعد خاک کا یہ مبتلائے مرض و صحت کی کشمکش سے ہمیشہ کے لیے نجات پاکر رفیق اعلیٰ سے جاملا۔ اور اپنے تمام دینی بھائیوں پر بجائے دعائے صحت کے دعائے مغفرت کا حق قائم کرگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوستوں، شاگردوں، اور معتقدوں کی جماعت کثیر سے قطع نظر کرکے اپنے خاص عزیزوں میں مرحوم نے ایک نوجوان بیوہ، ایک خورد سال بچی اور ایک دل شکستہ ماں کو چھوڑا ہے۔ ماں کی سرگذشت خصوصیت کے ساتھ دردناک ہے۔ کم سنی میں بیوہ ہوئیں۔ بجز خورد سال عبد الرحمٰن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ساری بیوگی اسی نونہال کے پروان چڑھانے میں بسر کردی۔ یہاں تک کہ مادی زندگی کا یہ بڑا سہارا بھی دغا دے گیا۔ ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے بدنصیبی نہیں انتہائی خوش نصیبی ہے کہ سارے سہارے مٹ کر صرف ایک ہی سہارا باقی رہ جائے۔ اور سب سے رشتہ ٹوٹ کر صرف ایک ہی سے رشتہ جڑا رہ جائے!

حسن عمل اب بھی مسلمانوں سے بالکل رخصت نہیں ہوگیا ہے، سرزمین ہند کے گوشوں اور زاویوں میں ابھی بعض بڑے بڑے زاہدان شب بیدار موجود ہیں۔ قومی کام کرنے والوں کی جماعت میں بھی ابھی چند نہایت مخلص اور پختہ ایمان جوان مرد زندہ ہیں، لیکن اگر میری دیانت سے یہ سوال کیا جائے کہ اب تک سب سے زیادہ معصوم زندگی، کس کی دیکھی ہے۔ تو اپنی واقفیت و تجربہ کے دائرہ میں بلا تامل صرف مرحوم عبد الرحمٰن کا نام پیش کرسکتا ہوں۔ نوجوانی کے باوجود اس قدر صالح و پاکباز رہنا

قومی و اجتماعی زندگی میں پوری طرح بڑھ کر بھی اس قدر محتاط و بے لوث رہنا محض عطائے الٰہی ولطف خداوندی کا ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ ذالك فضل الله یوتیه من یشاء۔
وہ صحیح معنی میں مسلم، مومن تھے۔ اسلام کی حقیقت ان کے دل کی گہرائی میں اُتری ہوئی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی صحبت، ان کی تقریروں سے بھی زیادہ موثر ہوتی تھی۔ اللہ پاک پر ہر وقت بھروسہ رہتا تھا۔ ذات مبارک نبویؐ کے ساتھ دلی شیفتگی تھی۔ جستجو وطلب صحابۂ کرامؓ کے دین فطرت کی تھی۔ متاخرین کے زوائد اور رنگ آمیزیوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ملکی وسیاسی آزادی کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی بصیرت کو قرآن کریم سے اسی کے احکام ملتے تھے۔ دینی خدمت کی ہر صنف اور ہر صورت کے لیے ان کی زندگی وقف تھی۔ تقریر و تحریر کے علاوہ اگر کوئی موقع جہاد بالسیف کا آجاتا، تو اس میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا۔ جزئیات عقائد میں روا داری خاص مسلک تھا۔ بجائے کسی خاص فرقہ کی جانب زیادہ جھکنے کے اپنا انتساب محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے "اسلام" ہی کی جانب پسند فرماتے رہے۔ شان رحماء بینہم کو پوری طرح نباہا۔ عقائد و خیالات میں اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی ہمیشہ نرم سے نرم تاویل پسند کی۔ ذاتی دشمن ہر شخص کے ہوتے ہیں، میرے تجربہ میں ان کی شخصیت اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ میں نے ان کا کوئی دشمن نہ دیکھا۔ وہ صحیح معنی میں درویش تھے۔ گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی، صبر و ضبط، فطرت ثانیہ بن گئے تھے۔ ماسوا سے بےتعلقی وبے نیازی زندگی کا جزو تھی، بڑی سے بڑی ترغیب نے بھی کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی۔ بارہا بڑے بڑے کٹھن وقت پڑے، اس کا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا۔ کلکتہ کے زمانہ قیام میں ایک مدت تک معاش کی یہ عسرت تھی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گذار دیا۔ لب کبھی حرف شکایت سے آشنا نہ ہوئے ۱۹۲۲ء میں ڈھاکہ کی سرکاری یونیورسٹی کی طرف سے علوم اسلامیہ کی پروفیسری کے لیے تحریک

ہوئی۔مشاہرہ جس قدر ندوہ میں پا رہے تھے اس سے بقدر چھ گنے کے زائد تھا شہرت وناموری وغیرہ اس پر مستزاد، اللہ کے اس نیک بندہ نے نہ صرف اس دعوت کو مسکرا کر ٹال دیا، بلکہ اپنے خاص خاص رفیقوں اور دوستوں سے بھی اس کا ذکر تک نہ کیا! قناعت، استغنا، ایثار، یہ الفاظ بار بار سننے میں آتے ہیں، دیکھنے میں ان کا پورا نمونہ عبدالرحمٰن کی ذات میں آیا تھا۔ وہ صحیح معنی میں متقی تھے۔ زبان، آنکھ، کان اور دل سب کو بدی بدکاری و بدخیالی سے روکے ہوئے تھے، حلم و تحمل خمیر میں داخل تھا۔ سخت سے سخت اشتعال کے موقع پر بھی غصہ آتے نہ دیکھا یتیموں پر شفقت، محتاجوں کی خبرگیری، بیکسوں کی امداد کے بغیر زندگی محال تھی، انکسار و فروتنی ہر ادنیٰ واعلیٰ کے مقابلے میں برتتے تھے۔ بڑوں کے ادب ولحاظ اور چھوٹوں کی محبت والفت سے کسی گھڑی خالی نہ تھے۔ نفل نمازیں پڑھتے تھے مگر چھپ کر، روزے بکثرت رکھتے تھے۔ مگر راز رکھ کر۔ بے لوثی و بے نفسی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی، خود داری کے جدید مفہوم (خودی، خودبینی، خودنمائی) سے بالکل ناآشنا تھے، ساری زندگی طاعت وعبادت، تقویٰ وطہارت میں گزاردی اور کبھی اپنی مذہبیت، پاکبازی، تقدس کی تجارت نہ کی۔ قومی واجتماعی زندگی میں پوری طرح بڑنے کے باوجود بھی کبھی آگے بڑھنے اور ابھرنے کی کوشش نہ کی، یہ آزمائش بھی ہر واقف کار پر روشن ہے کہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

دل کی ان ساری فضیلتوں کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ممتاز لے کر آئے تھے۔ صحیح معنی میں عالم وطالب علم تھے۔ علمی مصروفیتوں سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی۔ علوم میں سب سے زیادہ ذوق ودلچسپی کی چیز، کسی انسان کی نہیں، اللہ کی کتاب حکیم تھی۔ خاص شغف وانہماک اسی کے مطالعہ میں تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی سارے دینی و مذہبی ذخیرہ وادبیات پر گہری اور وسیع نظر تھی خدمت دین کی غرض سے انگریزی کبھی بقدر ضرورت پڑھ

لی تھی ۔ حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہنے کے لیے بکثرت اخبارات و رسائل کا مطالعہ برابر جاری رہتا تھا ۔ ذہن بیں سلجھاؤ تھا ۔ حسن ترتیب ، حسن بیان ، سلاست زبان ، ذوق انشاء کی شہادت ، ان کے قلم کی نکلی ہوئی ہر سطر دے رہی ہے ۔ الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا کہ اس نادر شخصیت ، اس جامع کمالات ، اس حیرت انگیز نمونۂ عمل کی وفات سے امت اسلامیہ نے کیا کچھ کھو دیا ۔ بہر حال تقدیر الٰہی پوری ہو کر رہی اور بجز صبر و شکر کے اب کسی کے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہیں ۔

پچھلے سال اسی ماہ مبارک رمضان کے آغاز میں مجھے قلب کا ایک سخت دورہ پڑا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ حرکت قلب فوراً بند ہوا چاہتی ہے ، افاقہ ہونے پر میں نے ایک مختصر وصیت نامہ تحریر کیا تھا ۔ اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ میری تجہیز و تکفین ، نماز جنازہ وغیرہ جہاں تک ممکن ہو (منجملہ اور دو تین صاحبوں کے) مولوی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں انجام پائے ۔ رفیق اعلیٰ کی رفاقت اعلیٰ کے اختیار کرنے پر حریش عبدالرحمٰن ! جس شخص کو تمہارے خلوص ، تمہاری برگزیدگی ، تمہارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا ، کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اسی کے اعتماد کو شکست کر دوگے ۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ اسی بدنصیب کو ، آہ تمہاری تعزیت و ماتم میں اشکبار ہونا پڑے گا ! بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند عبدالرحمٰن ! جس ماں نے اپنی بیوگی اور پھر کم سنی کی بیوگی ، تمھیں کو دیکھ کر پار کر دی ، اور جس نے اپنی ساری خوشیوں اور آرزوؤں ، حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمہارے ہی مکھڑے کو رکھا ، آج دکھیاری کے کلیجے کے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہ رہے ہیں ! کیا یہ حسرت وہ اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جائے گی ، کہ ایک بار تم اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو آکر پونچھ دو ! ـــــ نوجوانی میں ایک عصمت مآب پردہ نشین کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دینے والے عبدالرحمٰن ! جس دلا روں کی پالی کو تم اس کے وطن سے

بے وطن کرکے، اس کے ماں باپ سے چھڑا کر اس کے بچپن کی سہیلیوں سے جدا کرکے اس کاڈ دلا بڑے شوق و ارمان سے اپنے ہاں لائے تھے، جس کا لباس عروسی بھی ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا؛ اور جس حسرت نصیب کو آخری وقت میں تمھاری خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا، آہ آج اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے! کیا اب بجز حشر کے اب تمھارا دیدار اسے نصیب نہ ہوگا؟ معصوم بچی کے معصوم صفت والد عبدالرحمٰن! تم تو غیروں کے یتیموں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر رکھتے تھے آج خود تمھاری ننھی معصوم تمھارے غم میں کیسا بلک رہی ہے؟ کیا اس کے سر پر اب نہ کوئی ہاتھ پھیرے گا جو یتیموں، غمزدوں، بیکسوں اور بے وارثوں، سب کا حقیقی والی و وارث ہے؟ عزیزوں سے بڑھ کر عزیز، مخلصوں سے بڑھ کر مخلص عبدالرحمٰن، اپنے ایک گنہگار و شکستہ دل بھائی کی جانب سے سلام و رحمت، مغفرت و رحمت کی بے گنتی اور دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا ہدیۂ حقیر قبول کرو۔ تمھاری آنکھوں سے آج پردے اُٹھ چکے ہیں، لفظ و عبارت سے گزر کر آج تم معنی و حقیقت کے محرم اسرار ہو چکے ہو۔ جمال سرمدی کے بے حجاب نظارے سے تم آج شاد کام ہو رہے ہو۔ تمھیں اپنی ان خوش نصیبوں کا واسطہ اور جس بے نیاز کی حریم ناز میں شرف باریابی حاصل کر چکے ہو، اسی کی عظمت و کبریائی کا صدقہ لھم ما یشاؤن عند ربھم کے مرتبہ پر فائز ہو کر اور راضیۃ مرضیۃ کے خلعت سے سرفراز ہو کر اور لھم ما یشاؤن فیھا ولدینا مزید کے انعامات سے مالا مال ہو کر اپنے گنہگار اور بدنصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی جو حالت دیکھ گئے ہو، اس سے غافل نہ ہو جانا اور اللہ کی یکتائی کے زبانی اقرار کرنے والوں کے حقوق کو فراموش نہ کر جانا! دنیا نے اگر تمھیں نہیں پہچانا تو معذور تھی۔ اہل دنیا اگر تمھاری قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکے،

تو کچھ ہرج نہیں۔ جس سے تم کو اور ہر نیک و بد کو آخری اور دائمی سابقہ پڑنے والا ہے وہ تو بہر حال بے خبر نہیں،
کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

---

(۲) محمد علیؒ

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت، بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو انکا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت اٹھا لیا جائے گا، جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا، جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے؟ اس پچھلے زمانے میں ۱۵۔۲۰ سال کے اندر مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گذری، کیسے اکابر اٹھا لیے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا پڑا انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا۔ ترکوں پر "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ وبالا ہوا۔ عراق میں خاک اُڑی، مصر کا سرِدار اُٹھ گیا، شام میں آسمان رو دیا، فلسطین میں

؎ پیج ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء

زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لیے مرہم تھا۔ ہر تازہ صدمہ کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اسی خیال سے کہ جو کچھ بھی چلا جائے۔ محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جس پاک و بے باک بے نیاز نے پیمبر محمدؐ کے لیے یہ منادی کر دی تھی کہ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم" اس کے فرشتوں نے اس کے بندوں تک اس پیمبر کے ایک وفادار اُمتی کے لیے بھی یہی صدا پہنچا دی! اے پاک پروردگار، اے سب کے جلانے والے اور سب کے اُٹھانے والے مولا۔ تیرا ارادہ بے شک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر قادر، لیکن کیا ہم جیسے ناتوان و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش اتنے بڑے ابتلا، اتنے کڑے، امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمائشیں تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہیں۔ ہم کم ظرف کیا اس لائق تھے کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑاتے ہوں، عین اُسی وقت، ہماری سب سے بڑی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ جس کے لیے دل چاہتا تھا کہ اس کی موت کی خبر کبھی نہ سُننی پڑے، اُسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور اُس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا بھی تصور نہیں لایا جا سکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک انصاف کر کہ تیرے حبیب و محبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق پُرجلالت کا قلب تاب نہ لا سکا تو تیرے اُس حبیب پاک کے ایک ہم نام غلام

کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان ونابینا تو ادنیٰ سے ادنیٰ آزمائش کا بھی تحمل نہیں کرسکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لیے دل وجگر کس سے مانگ کر لائیں!

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں کی جا رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس کی جا رہی ہیں، کہ ایک بڑا قومی لیڈر اٹھ گیا، نیشنل کانگریس کا سابق صدر چل بسا، ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہو گیا، یہ سب کچھ صحیح ہوگا لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا کہ اللہ کا بندہ اٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہو گیا۔ آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک جادو بیان مقرر اور بہترین انشا پرداز گم ہو گیا۔ ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہو گیا، جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا جس نے اپنی دنیا برباد کرکے، اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا، جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، ایک ہی دھن ہوتی تو رسولؐ کی نصرت و خدمت کی! اس کی سچی آپ بیتی خود اسی کے ایک شعر میں سنئے ؎

سب کھو کے تری راہ میں میں دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

بے شک اس نے دنیا اور دولت دنیا، ساری کی ساری کٹ کے رکھ دی، اور کھوئی بھی کس کی راہ میں! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا، "پاتے" ہوئے اور "لیتے" ہوئے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی اور "کل" انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

وجاہت، ناموری، شروع ہی سے حصہ میں آئی، علیگڈھ میں نام پیدا کیا، آکسفرڈ جاکر ناموری کہاں سے کہاں پہونچی، "سول سروس" کی جانب لپکے، اُلٹے پاؤں واپس کئے گئے، رآم پور اور بڑودہ دو درباروں کی قدر شناسیوں کا چند روزہ مزہ چکھا بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعائے، جو غلاف کعبہ کو پکڑ کر رب کعبہ سے مانگی گئی تھی، کہ "میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنادے" قبولیت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جو نہ صرف مسٹر تھا، بلکہ اپنے وقت کے مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا، چہرہ پر داڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز، اور دین کی تڑپ! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی۔ ایک جوشش تھی کہ ہر آن کو خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچی نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے ملامت۔ قابلیت کا اعتراف سب کو خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کامریڈ و ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر پڑھا لکھا، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظربندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں۔ اور آخر عمر میں اس سے بھی بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں سے بےتعلقی، آویزش، جنگ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمیعۃ العلماء سے جنگ، پنجابی ٹولی سے جنگ، بنگالی ٹولی سے جنگ، احناف سے جنگ، اہل حدیث سے جنگ۔ ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی۔ اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شروانی، مجید، خواجہ ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لیے، ساری خدائی سے جنگ۔ دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا لیکن جس کی

نگاہ یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اُسے کوئی کیا سمجھاتا اور کیوں کر روکتا، اللہ کا شیر اللہ کے لیے، سب سے لڑا، اور خوب لڑا، شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اُسے سچ کر دکھایا، کہا کرتا تھا اور بالکل سچ کہا کرتا تھا کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔ احباب بار بار بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا ہے کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دل شکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، "کامریڈ" و "ہمدرد" ہی کو آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں چلایا جا سکتا، کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور و غل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضائع کر دیا، ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پبلسٹی پر جم جانا تھا۔ دوسرے صاحب فرماتے، تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی۔ اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی "دیوانہ" ہو چکا تھا، اُسے جو کچھ دکھا دیا گیا تھا، اس کے دیکھ چکنے کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد   مرعس را دید و در خانہ نشد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے کہ محمد علی کو "نیشنلسٹ" ثابت کر دکھایا جائے۔ حالانکہ وہ "دیوانہ" عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی کے اس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا، جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے نہ "کمیونزم" ذات مد نظر اپنے ذوق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو اتنا اونچا ہو چکا اُسے نیشنلزم کی پستی پر

زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اُس کے لیے باعث فخر یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندستان" کے بُت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا۔ اُسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اس کی ہندوستانیت بھی ماتحت تھی اُس کی اسلامیت کے! وہ "خدا" اور "وطن" دو کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف "خدا" کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی بتائی ہے، اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے وابستہ کی گئی ہیں اور جب وہ اُمیدیں اُن پاکوں کی ذات سے پوری نہیں ہوئی ہیں تو ناپاکوں نے اُن پر حملے خوب خوب کیے ہیں۔ آج کی یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آ رہی ہے قالوا یا صالح قد کنت فینا مرجوا قبل ھذا اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا و اننا لفی شك مما تدعونا الیه مریب۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے دعویٰ محبت کا کیا اُس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چیرا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا۔ کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک و خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا، اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا، محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اُسے یوں ہی بے امتحان و آزمائش کے چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، مجنوں اور عاشقوں، سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لیے تو یہی

ایک قاعدہ مقرر ہے۔ ذلت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکست نفس۔

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر — عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ — عشق عاشق جان او را سوختہ

محمد علی تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مرا کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے اور پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے۔ والذین آمنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا ہی روشن چہرہ لیے ہوئے، عالم برزخ میں جنت کی سیر کر رہا ہے اور تیرے نیازمندوں کو اپنی جگہ پر یقین ہے کہ تیرا اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کرے گا، اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا، جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا۔ اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروروں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور پیش روی کا علم تیرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیق خاص غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ و ایڈیٹر نو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے۔ وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے،

ابھی مرنا تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کیے ہوتے

خوب کٹتا بہشت کا رستہ   ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بدنصیب قوم، تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی وارث چل بسا، تیرا سہاگ لُٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! خستہ بخت ملت آج تو یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایہ پدری اُٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی، صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے! وہ ہر نیست کو ہست، ہر محال کو ممکن کر دکھانے پر قادر ہے، لیکن ہم اسباب ظاہری کے گرفتار بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علی کی عمر کل ۵۳ سال کی ہوئی، حضور انور نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی مکی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا قبل اس کے کہ مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے، خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! "آج" کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ "کل" کس کس طرح نکل کر رہتیں!

---

(۳)

راجہ علی محمد خاںؒ

محمد علی کے بعد علی محمد! سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ ملت نے محمد علی کا داغ سینہ پر کھایا، سنہ ہجری شروع ہوا، علی محمد خاں نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ قوم کا خادم جب رخصت ہوا تھا اور وطن کا مخدوم اب!

آج وہ، کل ہماری باری ہے!

آج "مہاراجہ" کی باری آئی، کل "مہاپرجا" کی باری تھی۔ شب برات میں ایک کی طلبی ہوئی، محرم میں دوسرے کی شادی سننی پڑی، غربار امت کا جگر "کل" پھٹ چکا تھا، امرار امت کا بازو "آج" ٹوٹ کر رہا! کن کن حسرتوں پر روئیے اور دل کو کیا کہہ کر سمجھائیے! خاص و عام، امیر و غریب راجہ اور پرجا، سب کے سب، آہ! حسرت و یاس کی تصویر، مجبوروں سے بڑھ کر مجبور اور یتیموں سے بڑھ کر یتیم! انسان ضعیف البنیان، کائنات کے ذرہ ذرہ کی حرکت کو اپنی مرضی کے تابع دیکھنے کا آرزومند، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آج تک کبھی پروا کی گئی ہے؟ جس حکمت کاملہ نے عالم

---

[۱] سچ ۵ رجون ۱۹۳۱ء

کے سرور و سردار کو مخاطب کرکے اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ کی منادی کردی
اس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی!
جو بھیجے گئے تھے وہ واپس بلا لیے گئے، اور جس نے بھیجا تھا، وہ اُسی آن اور اُسی
شان، اسی جاہ، اور اُسی جلال اُسی حسن اور اسی جمال، اُسی دارائی اور اُسی
کبریائی، اُسی رعنائی اور اُسی دل ربائی، اُس ناز اور اُسی خوبی، اُسی حسن اور
اُسی زیبائی کے ساتھ، جوں کا توں قائم و موجود، حی و قیوم!

مٹ گیا نقش احمد و محمود ۔ رہ گیا لا الٰہ الا اللہ

کہتے ہیں کہ راجہ (پرانے نیاز مندوں کی زبان بجائے لفظ مہاراجہ کے "راجہ"
ہی کی عادی ہے) علی محمد خاں شیعہ تھے، ہوں گے۔ زبانوں پر چرچا ہے کہ بڑے
نیشنلسٹ تھے، یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن میں جن راجہ صاحب محمود آباد سے واقف تھا، وہ
مسلمان ہی تھے اور نرے مسلمان، اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان، محمد علیؓ کی سی
تڑپ اور تپش نہ سہی، پھر بھی زبان پر محمدؐ کا کلمہ، دل میں اسلام کا درد اور دماغ
میں مسلمانوں کی خیر اندیشی۔ دسترخوان کی وسعت ہر مسلمان کے استقبال کو موجود، خزانہ
کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لیے کھلی ہوئیں دولت کی تمنا تھی تو مسلمانوں پر زر پاشی
کے لیے، اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے۔ ایک فیض
کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لیے۔ ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آبیاری کے لیے۔
ایک جود و عطا کا بادل تھا جو امنڈ امنڈ کر برسا اور ہر طرح برسا کہ اپنے رقبہ محدود
تشنہ لب نہ قوم کو چھوڑا نہ افراد قوم کو، اس کا در حاجتمندوں کا مرجع، اس کی ڈیوڑھی
ناداروں کی امید گاہ۔ کم نصیب تھا وہ جو اس کے ہاں سے مایوس اور اُس کے
پاس سے محروم واپس ہوا۔

صوبہ کا ایک شریف سنی مسلمان حج کے لیے روانہ ہوتا ہے اور رخصتی ملاقات کے وقت بغیر کسی حق سابق کے اپنے لڑکے کا ہاتھ اس شیعہ رئیس کے ہاتھ میں دیدیا جاتا ہے، حاجی کو حج مسعود نصیب ہوتا ہے اور استراحت دائمی کے لیے حرم پاک کی سرزمین یتیم لڑکا کالج کی اعلیٰ تعلیم میں زیر تعلیم ہے، اور ختم تعلیم میں ایک سال کی مدت باقی ہے، دریا دل شیعہ رئیس کو اطلاع ہوتی ہے اور بارہ مہینہ کے بجائے پورے سولہ مہینہ کے لیے اور جو ماہوار رقم للعہ کے حساب سے ہوتی تھی اس کے بجائے پورے، غشہ کر کے آٹھ سو کی مجموعی رقم بنیک میں اس کے نام سے جمع کردی جاتی ہے!

لکھنؤ کے ایک نہایت شریف و ممتاز اہل سنت خاندان کی ایک مسکین بیوہ کی جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے، سامان مفلسانہ و غریبانہ حیثیت کا بھی میتسر نہیں یہ شیعہ رئیس کو خبر ہوتی ہے، اور دوسری صبح کو ایک معتمد خاص کے ہاتھ ایک معقول رقم چپ چپاتے اسی بیوہ کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے ——— یہ جس محمود آباد کے غم میں افسردہ و ملول ہوں وہ یہ شخص تھا۔ اس کی فیاضیوں کے بیشمار واقعات میں سے یہ دو صرف نمونہ کے طور پر یاد دلادیئے گئے۔ وہ محمود آباد نہیں جو قومی لیڈر اور نیشنلسٹ پارٹی کا افسر، مسلم لیگ کا صدر، اور مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر، لکھنؤ یونیورسٹی کا ساعی اور بانی، چیف کورٹ کا محرک، گورنر بٹلر کا دوست، اور گورنر مسٹن کا دشمن، انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف اور اردو روزنامہ ہمدم کا پردہ پر مالک، یو، پی گورنمنٹ کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا کے، سی، آئی، ای تھا۔ وہ مسکین نواز و یتیم پرور، شریفوں کا سرپرست اور حاجتمندوں کا حاجت روا، بے وارثوں کا وارث، غریبوں کا دستگیر، مہمان نواز و سیر چشم، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا۔ اس کے بڑے

بڑے شاہانہ چندے، اور لکھو کھا لاکھ کی قومی فیاضیاں سب نے دیکھیں اس کی چھپی ہوئی خیرات اور پوشیدہ زر پاشیوں کی خبر، مخلوق میں ہے کس کو؟

دنیا اور اس کی جگمگاہٹ ختم ہو چکی نیشنلزم اور کمیونزم کے مناقشے تمام ہو چکے۔ بندہ اپنے مالک کے پاس پہونچ چکا۔ راجہ پرجا بن کر حقیقی مہاراجہ اور اصلی شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ نوحے لکھے جا رہے ہیں، رزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، تقریروں میں قوت خطابت کے کمالات دکھائے جا رہے ہیں اور شعرا نامدار مضمون آفرینیوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ مہذب دنیا کی ان طلسم آرائیوں کو چھوڑ کر آئیے، ہم اور آپ مل کر، سیکڑوں اور ہزاروں، محتاجوں اور دردمندوں یتیموں اور بیواؤں مسکینوں اور معذوروں کے ہم آہنگ ہو کر، مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت اُس رب الارباب کے حضور میں پیش کریں، جس نے اپنی رضا ناتوانوں اور کمزوروں، بیکسوں اور دل شکستوں کی رضا میں مخفی کر رکھی ہے، آج نہ راجگی باقی ہے نہ مہاراجگی، نہ ٹیلر کی دوستی کام آ رہی ہے نہ حکومت کی ہوم ممبری نہ سرکاری خطابات پوچھے جا رہے ہیں، نہ انجمن تعلقداران اودھ کی صدارت نہ کوئی مصاحب و رفیق میسر ہے نہ کوئی مشیر۔ ہاں، آج قدر ہو رہی ہے تو اُن بھوکوں کو کھانا کھلانے کی، جو دانہ دانہ کو ترس رہے تھے، اُن ننگوں کو کپڑے پہنانے کی، جو ایک ایک دھجی اور ایک ایک چیتھڑے کے لیے آسمان کا منہ تک رہے تھے۔ جو مخلوق کی نظر میں حقیر اور بیچارے تھے، وہ خالق کے دربار میں عزت والے نکلے، جنھیں کچہریوں کے پیادوں اور کوٹھیوں کے دربانوں نے دھکے دے دے کر نکالا تھا، انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے ملائکہ کی صفیں آگے بڑھیں۔ جس نے دنیا میں ان ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا، ان ٹھکرائے ہوئے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تھا، اس کی بشری کمزوریوں اور لغزشوں کا شمار کچھ بھی سہی، کیا اُس مولا کے دربار میں، جو کریموں کا کریم ہے، اس

کے ساتھ بجز لطف و مرحمت، بجز عفو و مغفرت کے کس اور معاملہ کی بھی توقع ہوسکتی ہے؟ جا! اے نیک دل رئیس! اے امت مرحومہ کے غمخوار و غمگسار، اپنے رب اور اپنے مولا کے حضور خوش خوش جا! خائف و متردد نہ ہو، کہ آج تیری حمایت اور پشت پناہی پر تیرا بوجھ اپنے سروں پر اُٹھا لینے کو یتیموں کی فوج کی فوج، بیواؤں کی قطاروں کی قطاریں اور بیکسوں اور بینواؤں کی صفوں کی صفیں ہیں!

۴

ہم نام نا موڑ[1]

سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ قوم کو ناخدائے قوم، محمد علیؒ کا داغ سہنا پڑا سنہ عیسوی ختم ہو رہا ہے کہ دوست و محب عبد الماجد بدایونی یک بیک اور دفعتہً اپنے پست اور راندۂ رفیقوں کو چھوڑ کر، اس بے وفا دنیا سے منہ موڑ کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے! سنتے چلے آئے تھے کہ آغاز و انجام میں ایک رشتہ ہوتا ہے اور "اول با آخر نسبتے دارد" کسے خبر تھی کہ جو سال شروع یوں ہوا تھا وہ ختم بھی یوں ہوگا، اور کون کہہ سکتا تھا کہ ملت کے حق میں یہ پرانی ضرب المثل اپنے اس دردناک معنی میں صادق آکر رہے گی!

شعبان سنہ ۴۹ھ آیا، تو ماتم اس کا کرنا پڑا جو تحریک خلافت کا بانی و علمبردار تھا شعبان سنہ ۵۰ھ آیا تو زخم اس کا اٹھانا پڑا، جو اس وقت مرکزی خلافت کمیٹی کا صدر تھا کہتے ہیں کہ اس ماہ مبارک میں ایک شب مبارک ایسی آتی ہے، جس میں سال بھر کے لیے افراد و اقوام کی قسمتوں کے فیصلے صادر ہوتے ہیں، کیا ہم شوربختوں کی قسمت میں اب لیلۃ البرات کے معنی، صرف نالہ و فریاد، یتیمی و بیوگی، حسرت و حرماں، غم و الم،

---

[1] صدق ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء

شیون و ماتم کے رہ گئے ہیں؟ نہیں، شعبان کو تو نبیؐ نے اپنا مہینہ کہہ کر پکارا ہے، شعبان کو "شہری" کے خلعت سے سرفراز کیا ہے۔ اسے سال کے سب مہینوں سے محبوب تر قرار دیا ہے (کان احب الشہور الی رسول اللہ صلعم شعبان۔ ابوداؤد) حق ہے کہ اُس آقا کے سرفروش غلام اسی مہینہ کو اپنے لیے اختیار کریں۔ اور اُس شمع کے پروانے، اپنی اپنی جان کے نذرانے، اسی محبوب زمانہ میں لے کر آگے بڑھیں!

مرحوم بدایوں کے مشہور و معزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے، ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوئے۔ ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک، دوسروں کو کھلا کر کھانے والے۔ تحریک خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیار زندگی بدل دیا اور معاشرت بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کر لی۔ جیل نہیں گئے، لیکن جیل پہونچنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعۃً ترک کر کے، درویشانہ زندگی اختیار کر لینے کا مجاہدہ بھی جیل خانہ کے مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ خلافت، جمعیۃ علما، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس، اور آخر میں پھر خلافت، جس تحریک میں بھی شریک ہوئے دل و جان، شغف، انہماک، مستعدی و سرگرمی، سے شریک ہوئے جس کام کو ہاتھ لگایا اُس میں جان ڈال دی۔ زندگی کے آخری ۱۱-۱۲ سال کا ہر روز بلکہ کہنا چاہیے، ہر گھنٹہ قومیات کے لیے وقف تھا، سکون و راحت کا کوئی زمانہ نہ تھا، مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے باوجود کام کے پیچھے دیوانے تھے۔ اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ تیز بخار چڑھا ہوا اور حجاز کانفرنس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے اور امین آباد میں محفل میلاد۔ ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے تک بیان کر رہے ہیں۔ شانے میں ورم، ہاتھ جھولے میں پڑا ہوا، لیکن یہ کیسے ممکن کہ مجلس تنظیم کی مجلس عاملہ میں شرکت نہ ہو۔ والدہ ماجدہ نزع میں، اور مولانا کانپور میں تقریر کر رہے ہیں۔ بڑی بہو کی آخری سانسوں کی

اطلاع آرہی ہے اور آپ ہیں کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رُلا رہے ہیں۔ کل لکھنؤ میں تھے، آج کلکتہ پہونچ گئے۔ عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا نماز آکر میرٹھ میں پڑھی، صبح پٹنہ میں تھے۔ شام کو معلوم ہوا کہ دکن کے راستہ میں ہیں۔ عجیب و غریب مستعدی تھی، عجیب ہمت و مردانگی! تحریک خلافت کے، کم از کم اپنے صوبہ میں تو شاید سب سے بڑے پُرجوش مبلغ اور علمبردار تھے۔ مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس اجمیر واقع مارچ ۱۹۲۲ء میں جو ہنگامہ خیز تقریر کی تھی اس کی گونج اب تک کانوں میں سنائی ہوتی ہے، کانگریس نے بھی ایک زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تو بہر حال تھے، غالباً اس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ اور تحریک تنظیم ۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء والی تو جب تک زندہ رہی، بڑی حد تک انھیں کے دم سے جیتی رہی، مسیح الملک اجمل خاں مرحوم اور رئیس الملت محمد علیؒ دونوں سے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، شائد انھیں سے ملنے کی جلدی تھی جو وہ مضطرب روح، سب کو مضطرب چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔

لکھتے اچھا خاصہ تھے، متعدد رسائل و مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں لیکن جیسا لکھتے تھے، اس سے کہیں بہتر یا بدرجہا بہتر، بولتے تھے۔ مقرر، اور موثر مقرر، ہر موضوع پر کر سکتے تھے، سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے، اور مجلس کو رُلا دیتے تھے، لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی حبیبِ ربّ العالمین کا ذکر پاک کرنے کو اٹھتے تو آپے میں نہ رہتے۔ کھڑے ہو کر بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے، اور شاخ و گل کی طرح جھومتے اور لچکتے، خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی، اور خوش بیانی مست ہو ہو کر منہ چومتی۔ ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور ایک ایک جملہ نظر آتا تھا کہ سوز و گداز کے عطر میں بسا ہوا نکلتا

چلا آرہا ہے! فصاحت و بلاغت کا ایک دریا تھا کہ اُبلا پڑتا ہے۔ کیا ابھی ربیع الاول میں جنت کی حوروں اور آسمان کے فرشتوں کو بھی اس کا شوق ہوا ہے کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں۔ اس کی نعت ایک خاکی زبان سے بھی سُنیں؟

بڑے زبردست و خوش عقیدہ صوفی تھے۔ نادریت حد توغل تک پہونچی ہوئی ہر بزرگ کے ادب شناس، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش، بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے لیکن شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے پوری طرح معتقد۔ بڑے ذہین، بڑے ذکی، شوخ وطباع۔ بڑوں کی عظمت کرنے والے۔ چھوٹوں پر شفقت رکھنے والے، متواضع و خوش اخلاق، فیاض و مہمان نواز، سو وصفوں کا ایک وصف یہ تھا کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے۔ دل سے ملتے، تکبر سے دور، تمکنت سے نفور پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے، اور اپنے اعزاز و وقار کی ذرا پروا نہ کرتے۔ جس کے دوست ہو گئے آخر تک ساتھ دیا۔ دوستی کا حق نباہ دیا۔ وضعدار ایسے کہ دوستوں اور دوستی کے اوپر سب کچھ قربان کر دیا۔ لڑتے تو جلد معاف کرنے پر تیار ہو جاتے روٹھتے تو بخشنے میں دیر نہ کرتے۔ دوستوں سے خفا ذرا جلد ہوتے، خوش جلد تر ہو جاتے۔ ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے اور چھوٹے بڑے کی خدمت پر کمربستہ رہتے۔ لکھنؤ میں ایک مرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی خود دوڑ دوڑ کر مہمانوں تک کھانا پہنچاتے تھے، اور شیخ ہو کر مریدوں سے بڑھ کر کام کر رہے تھے۔

مرنے والے، اپنے مالک و مولا کے حضور میں جا اور اپنے ایک ادنیٰ و گمنام ہمنام کا آخری سلام لیتا جا! تو نے اپنے وطن سے دور، مسافرت میں موت پائی، اور تیرے سچے سردار نے اس موت کو شہادت کی موت فرمایا ہے۔ تیرے نامور آقا نے اپنا سفر آخرت

دوشنبہ کی صبح کو اختیار کیا تھا۔ تیرا رخت سفر بھی اس سے کچھ ہی قبل شب دوشنبہ میں بندھا تیری خوش نصیبی میں کسے شبہ؟ لیکن تو دوسروں کے بچوں پر رحیم و شفیق تھا، آج خود تیرے کمسن بچوں اور بچیوں کے سر پہ ہاتھ کون پھیرے گا، تیرا دردمند دل بیوہ کی اعانت کے لیے تڑپ جاتا ہے۔ آج خود تیری لٹی اور اجڑی ہوئی بیوہ کی غم گساری کون کریگا؟ تو ہر مسلمان کے حق میں قوت بازو تھا۔ آج خود تیرے بھائی کے مجروح دل پر کون مرہم رکھے گا تو قوم کے دھندوں سے کسی وقت خالی نہ تھا، اب اس بیڑے کی ناخدائی کون کرے گا؟۔

ہاں وہی کرے گا جو تیری طرح فانی نہیں، باقی ہے، عبد نہیں رب ہے بے بس نہیں، قادر ہے، جو ہر یتیم کے حق میں باپ سے کہیں بڑھ کر شفیق، ہر بیوہ کے لئے شوہر سے کہیں بڑھ کر غمگسار، ہر مسلمان کے لیے بھائی سے کہیں بڑھ کر سامان تقویت، اور قوم کے حق میں ہر سردار قوم سے کہیں بڑھ کر ناصر و حافظ ہے۔ جو اُن کا سہارا ہے جن کا کوئی سہارا نہیں۔ وہ جس خاک کے پتلے سے، جب تک جو کام چاہتا ہے لیتا رہتا ہے اور جب چاہتا ہے، اپنے حضور میں بلا لیتا ہے۔ بقا ہے تو ایک اسی کی ذات کو اور دوام ہے تو بس اسی کے نام کو اور اسی کے کام کو!

۵

خوش نصیب گول کیپر[۱]

تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد۔ سنہ غالباً ۱۹۰۷ء تھا اور جاڑوں کا زمانہ؛ علی گڑھ کی فٹ بال ٹیم، لکھنؤ، میچ کھیلنے کو آئی۔ ادھر علی گڑھ کے کھلاڑی گیند بلے کے کرتب میں اپنا سکہ جمائے ہوئے، ادھر لکھنؤ کی خلقت، کھیل تماشے کے شوق میں امڈی ہوئے، شہر میں ایک دھوم مچ گئی، میچ پرانی کیننگ کالج گراؤنڈ پر تھا، قیصر باغ کے مشرقی و شمالی سرے پر تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، امیر غریب، جوان، بوڑھے، طالب علم، سودے والے بھی اور اسی ہجوم میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالب علم بھی۔ علی گڑھ کے کھنڈرے ایک سے بڑھ کر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علیگڑھ کے گول کیپر پر جمی ہوئی، ایک سرخ و سفید قوی و تنومند، خوش رو نوجوان پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لیے خلق ہوا ہے۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ پھر پھر کر کیسے کیسے حملے کرتی، اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام!

---

[۱] صدق ۳ رمئی ۱۹۳۰ء

بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضب ناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں! یہ تھا علیگڈھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ، "تصدق" کون کہہ سکتا تھا کہ اسے چند ہی روز بعد کھیل کود میں نہیں، فٹ بال فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبہ کے اندر نہیں، سیاسیات و قومیات کی سنجیدہ اور خشک دنیا میں ہندوستان بھر کے طویل و عریض رقبہ میں بڑی بڑی زبردست ٹیموں کے مقابلہ میں ملک و ملت کی گول کیپری کے فرائض انجام دینے ہوں گے!

سب سے پہلی زیارت یوں ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ سننے میں آیا کہ کھیل کا مرد میدان، یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے اور اچھا خاصہ مقرر بھی۔ یونین کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو علیگڈھ سے واقف ہیں۔ دل خوش ہوگیا کہ جو جسم کا دھنی تھا اس کا دماغ بھی کورا نہ نکلا! ــــ چار پانچ برس کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے ــــ اب ۱۹۱۲ء آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری عشرہ۔ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے۔ اور پرانے قومی لیڈروں کے قلوب لرزہ میں! ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، فاؤنڈیشن کمیٹی، ہر قومی ادارہ میں گڑبڑ۔ ہمدرد اور الہلال کی معجزانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں (آزادی کی تحریکوں کا بگل بج چکا ہے) "وفاداری، حکومت" اور "مطالبۂ حقوق" کے درمیان پوری شد و مد کے ساتھ پہلی بار طاقت آزمائی ہو رہی ہے، ایک طرف سب کے سب پرانے لیڈر ہیں۔ یعنی وہ آقا جن کی زبانیں اُس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں اور دوسری طرف باغی، ابوالکلام اور شوریدہ سر محمد علی، مع اپنے چند نوعمر رفیقوں کے۔ اِن گنے چنے رفیقوں میں آپ کو باعتبار ظاہر جو سب سے زیادہ بلند نظر آ رہا ہے (اور بلحاظ باطن بھی وہ کس کے کم ہے؟) وہ وہی پرانا گول کیپر ہے

تصدق احمد خاں شروانی، علیگڈھ کا گریجویٹ اور لندن سے لوٹا ہوا تازہ وارد بیرسٹر۔

آج سے محمدؐ علی جو تحریک اٹھاتے ہیں، چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح کی ہو یا جنگ بلقان کے چندے کی یا قوم و ملت کی آزادی کی، تصدق شروانی سب میں سب سے پیش پیش۔ شیر دل جنرل کا ایک شیر دل لفٹنٹ۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء کی وہ ہنگامہ خیز تحریک، خلافت و ترک موالات شروع ہوئی، جس نے سارے ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک ہلا ڈالا۔ تصدق اُس وقت تک ایک کامیاب بیرسٹر ہو چکے تھے۔ اب اپنے پیشہ میں نامور۔ گھر کے خوش حال پہلے ہی سے تھے اور اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ پریکٹس چھوڑ دو، بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کرو جو سر اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے اُن السابقون الاولون میں ایک یہ بھی تھے، غالباً ۱۹۲۲ء تھا کہ علی گڈھ میں عدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا۔ شروانی ہنگامہ فرو کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو دل کے بخار نکالنے کا موقع ہاتھ لگا۔ دھر پکڑے گئے، اُلٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا، گئے تھے آگ بجھانے، مجرم آگ لگانے کے قرار پائے اور وہ جس کا کام قصور داروں کا چھڑانا اور خطا کاروں کو رہائی دلانا تھا، اب خود بے جرم و بے خطا قید فرنگ میں اسیر و محبوس تھا! ——— قید اور پھر قید سخت! غالباً کچھ روز کے لیے قید تنہائی بھی۔ ایک رئیس اور رئیس زادے کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی؟ بڑی بڑی تکلیفوں کو چھوڑیئے، تنگ و تاریک کوٹھری میں مچھروں ہی نے ایسا جھنجھوڑا کہ بے حال ہو گئے اور بیمار بن کر نکلے! ماں باپ نے نام تصدق رکھا تھا۔ کیا یہ نام، نام ہی رہتا! اور عزت کی، آرام کی، مال کی، جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی؟

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے۔ آزاد ہوئے اور پھر جکڑے گئے، وہ زندگی ہی کتنی بھی جو نے کر آئے تھے۔ لیکن بہر حال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب اسی الٹ پھیر میں گذار دی! ابھی دیکھئے تو علیگڈھ کی عدالتوں میں ہیں۔ الہ آباد میں صوبہ کی عدالت العالیہ کے نامور ایڈوکیٹ ہیں اور دوسروں کی بگڑی ہوئی بنا رہے ہیں، موتی لال کے مشیر، اور جواہر لال کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگرس کو اپنے اشارات پر چلا رہے ہیں۔ اور ابھی معلوم ہوا کہ لق و دق کوٹھی، سجی سجائی موٹر کار، نفیس مسہری، اور یہ دلکشا پائیں باغ، سب چھوڑ چھاڑ، چوروں اور اٹھائی گیروں کی سی میلی کچیلی جانگھیا پہنے کھڑے ہوئے نقب زنوں اور گرہ کٹوں کی قطار میں پھٹی گدڑی اوڑھے لیٹے، جیل کی کھری زمین پر پڑے ہوتے ہیں۔ بلند ہوا اقبال سرکار نامدار کا، جوہر شناسی اسے کہتے ہیں، قدردانی اس کا نام ہے، ہندوستان کی سرزمین کو کبھی کیوں ایسی خوش مذاق، نکتہ نواز، قدر شناس حکومت سے واسطہ پڑا ہوگا!

مرنے والا مر چکا، جینے والے اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزارہا روپے بیدریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے؟ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا، کوئی ہائیکورٹ کا جج، کوئی ہزاروں کمار ہا تھا، کوئی ہزاروں لٹا رہا تھا کوئی صوبہ کا منسٹر، کوئی ایگزکیٹو کونسلر۔ کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یوں ہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا؟ اس کے دل میں امنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اس کی بیوی بچے، دوست، عزیز بھائی بند نہ تھے

کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے، دنیا کا چین کرنے، زندگی کے سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا؟ کیا تکلیف اس کے لیے تکلیف اور راحت اس کے لیے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہو سکے تو سوچنے والے سوچیں۔

محمد علی جیل جا کر شاعر ہو جاتے تھے۔ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۳ء کی قید سے جب نکلے تو غزلوں کا ایک لشتارہ ساتھ لیے ہوئے۔ شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ہی شاعری میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے، جیل خانے سے قبل مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں علیگڑھ کے شروانی خاندان کے بعض اکابر سے بہت رنج اٹھا چکے تھے۔ رہائی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو خوب اشعار سننے میں آئے ایک بڑی سی غزل اس زمین میں سنائی "بیابانیوں میں ہم" "پریشانیوں میں ہم" اس میں ایک مشہور "وفادار" علیگڈھی بزرگ کی زبان سے فرمایا گیا تھا ؎

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی
گڈنی کے ساتھ جا لیں یونانیوں میں ہم

(ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے مسلمانوں کے "جیش انگورہ" کے مقابلہ میں "جیش یونان" کی تحریک کی تھی۔ یہ اشارہ اسی طرف تھا۔) اور تو اور اپنے بڑے بھیا تک کو نہیں چھوڑا تھا ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں:
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

(خبر آئی تھی کہ مولانا شوکت علی راج کوٹ جیل میں رہ کر بہت لاغر ہو گئے ہیں یہ تلمیع اسی کی ہوئی سناتے سناتے ارشاد ہوا کہ مزے کا شعر "تصدق" کی زبان سے کہا ہے، اسے ضرور سنیے۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

شرافت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے۔ ویسے تو جب تک دوستی و یک دلی ہے، سبھی اچھے نظر آتے ہیں۔ محمد علیؒ سے شروانی کا سیاسی اختلاف ۱۹۲۰ء ہی سے شروع ہو گیا تھا، روز بروز بڑھتا گیا۔ ادھر آغاز ۱۹۳۰ء میں مولانا کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہو کر رہی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صبح کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہو گی۔ مولانا کی لاعلمی میں دو چار نیاز مندوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے کچھ ماہوار رقمیں جمع کر لی جایا کریں، نام ہٹیے ہوئے۔ محبت و عقیدت کے دم بھرنے والے بعض اچھے اچھے بزرگوار اس امتحان میں نکل گئے۔ شروانی کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا، میں ذکر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ الہ آباد میں ایک بار جب جی کڑا کرکے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخ دلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا کہ مسرت کے ساتھ حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں! خیر وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی (زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استغنا کی بنا پر) لیکن شروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے، خوبیاں بہت تھیں، اس محبت و اخلاص، اس ہمت و مردانگی اس رواداری و فراخدلی، اس ذوقِ خدمت و تحمل مصائب کی مثالیں کمتر دیکھنے میں آئی ہیں۔ جمعہ کے دن کی موت، عین نماز فجر کے وقت، ہر ایک کے نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے اور پھر ہزار ہا مسلمانوں کی دعائیں۔ خوش نصیب گول کیپر دنیا اور آخرت، دونوں جگہ بازی لے گیا!

(۶)

شوکت علیؒ

ایک دور کا خاتمہ

نظرِتصور کو ۲۵ - ۲۶ سال پیچھے پھینکیے، مسلم یونیورسٹی کی نئی نئی تحریک کا وہ غلغلہ بلند ہے کہ ہر صدا، اس صدائے صور کے آگے دب کر رہ گئی ہے۔ کانسٹی ٹیوشن کیمٹی (مجلس ترتیب آئین وضوابط) کا اجلاس لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کی زیر صدارت قیصر باغ میں ہو رہا ہے۔ باہر کے تقریباً سارے معزز مہمان محمود آباد ہاؤس کے عالی شان و پر تکلف مہمان خانہ میں مقیم ہیں۔ ایک "صاحب بہادر" ایسے ہیں، جن کی "صاحبیت" کی تسکین صرف انگریزی ہوٹل ہی میں ٹھہرنے سے ہو سکتی ہے اجلاس ہو رہا ہے کہ دوپہر کے وقت یہی "صاحب" جلسہ گاہ، میں داخل ہوتے ہیں لحیم وشحیم، گراں ڈیل، رنگ سرخ وسفید، وضع وصورت میں بالکل انگریز، مونچھیں خوب گھنی اور خوب چڑھی ہوئی آنکھوں سے گویا شعلے نکلتے ہوئے۔ یہ آنے والے تھے شوکت علی! ۱۹۳۸ء کا "مولانا شوکت علی نہیں، ۱۹۱۱ء کا "مسٹر" شوکت علی" محکمہ

لہ صدق ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء

افیون کا اعلیٰ افسر، علیگڈھ کا مشہور کرکٹ کپتان اور مشہور تر فدائی، ہٹ چھوٹ اولڈ بوائے، چندہ بازوں کا سردار، بوڑھا نہیں جوان شوکت علی اور بوڑھا اس نے اپنے کو ۶۰ سال کے سن میں کبھی کب ہونے دیا تھا؟ دنیا کی عمر سال ڈیڑھ سال اور کھسکتی ہے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخیں ہیں۔ لکھنؤ میں وقت کی سب سے بڑی قومی مجلس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دھوم دھام سے ہو رہا ہے۔ سہ پہر کے وقت کانفرنس کے مہمان امریکیوں کے مشہور زنانہ کالج، ازابیلا تھابرن کالج میں چائے پر مدعو ہیں۔ جاڑوں کی شام آتے آتے ہی کیا لگتی ہے۔ نماز مغرب کا وقت آجاتا ہے۔ اچھی اچھی لمبی داڑھیاں رکھنے والے، جبہ و عمامہ والے اچھا حیص بیص ہی میں ہیں کہ اس تمام تر عیسائی و امریکی ماحول میں نماز کی صورت کیا ہو۔ ایک سوٹ پوش "نیچری" اٹھ کر انہیں امریکی کالج کے برآمدوں اور کمروں میں نماز جماعت کے لیے اعلان کر دیتا ہے۔ اور آ آ کر ایک ایک مہمان سے خوشامد کرتا ہے کہ "بھائی" خدا کے لیے اس وقت نماز جماعت میں شریک ہو جاؤ، دفعہ نہ ہو نہ سہی اس وقت تو ہمیں عیسائیوں پر اپنی نماز جماعت کا سکہ جمانا ہے"۔ یہ وہی سوٹ پوش، ہیٹ نواز شوکت علی ہے جس کا "قالب" اب بھی انگریز لیکن "قلب" جنگ طرابلس، و جنگ بلقان کے تجربوں کے بعد بحمد اللہ پوری طرح مسلم ہو چکا ہے ـــــ فقہا و اہل ظاہر جو کچھ بھی فتویٰ دیں لیکن اسے وہ ایک نماز بے وضو، ہو کتنی ہی با وضو نمازوں سے ان شاء اللہ، اللہ کے ہاں افضل نکلے گی! ـــــ خون کے چند قطرے بھی اگر کپڑوں میں لگ جائیں تو نماز درست نہ رہے لیکن شہید کا سارا جسم اس ناپاک خون سے ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور حکم یہ ہے کہ اس کو پانی سے پاک نہ کرو۔ اسی حالت میں اس کے جسم کو اللہ کے حضور میں پہنچا دو!

خون شہیداں را ز آب اولی ترست   ایں خطا از صد صواب اولی ترست

منظر بدلتا ہے۔ اور ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں نہ وہ صفاچٹ چہرہ رہتا ہے نہ وہ چڑھی ہوئی مونچھیں اور نہ وہ زرق برق انگریزی سوٹ۔ سر پر ہیٹ کی جگہ کلاہ، جسم پر ڈھیلا ڈھالا ترکی وضع کا موٹے کپڑے کا لمبا سا سبز کوٹ، چہرہ پر گھنی داڑھی اور لبیں کتری ہوئی۔ اب شوکت علی اسٹیشن کلب کی جان نہیں، انگریزی سوسائٹی کا منظورِ نظر نہیں۔ وہ نہیں، جس پر لیڈیوں کی نظریں پڑیں اور جس کی طرف انگریز افسران کے ہاتھ شیک ہینڈ (مصافحہ) کے لیے بڑھیں۔ وہی شوکت علی جو طالب علمی کے زمانہ میں نیچے درجہ کے طلبہ سے ان کی اچکنیں، شیروانیاں، اور کرتے اتروا کر انھیں سوٹ میں ملبوس کراتا تھا۔ ان کے گلے میں ٹائیاں بندھواتا تھا۔ جیسے مشرقیت سے گویا چڑھ تھی۔ اور جو کہنا چاہیے کہ "صاحبیت" کا باضابطہ مبلغ بنا ہوا تھا، اب سر سے پیر تک مشرقی تھا، اور ٹھیٹھ مسلمان، نہ ہی شوکت علی جو کبھی علیگڈھ کا پرستار تھا۔ اور اولڈ بوائز لاج کا فرمان روائے خود مختار، اب محض، خادم کعبہ تھے خادم نہیں کعبہ کا نہیں، کعبہ کے خادموں کا خادم، کعبہ کے زائروں کا چاکر، سینہ پر مجلس خدام کعبہ کا نشان لگا ہوا جب دیکھیے حاجیوں اور زائروں کی خدمت میں سرگرم! — موٹی کی گرمی کے رنگ کیسے بے حساب اور بندہ نوازی کے ڈھنگ کیسے بے شمار ہیں! بھاگے ہوؤں کو کس کس طرح پکڑ پکڑ کر، گھیر گھیر کر لاتے ہیں اور منہ موڑے ہوؤں کو کس کس طرح، کمندیں ڈال ڈال کر کھینچ بلاتے ہیں! —

اس کے بعد جتنے دور ہیں، سب کی نظروں کے سامنے ہیں، مقصود طول کلام نہیں۔ ہندوستان میں تحریک خلافت عبارت تھی ان دو بھائیوں علی برادران کی ذات سے! ہزاروں کے لیے جیل کی راہ آسان کر دی۔ خود کانٹوں کا تاج بار بار پہنا کر دوسروں کے لیے کانٹے پھول بن جائیں۔ بہ طول ہندوستان کے طول و عرض میں، شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک گاندھی جی اور محمد علی کے ساتھ مل کر

بے تاج کی بادشاہت کی مسلمان تو مسلمان، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں، سب سے اپنا کلمہ پڑھوایا۔ اور لکھو کھا بلکہ شاید کروروں کی زبان سے اللہ اکبر کے نعرے لگوا دیئے اپنے مولا کی بڑائی پکروا دی اور پھر برسوں بعد وہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، خوب سہ لیا، بھگت لیا، جب بیگانے نہیں خود اپنے بیگانے بن چکے تھے اور جنھیں کل تک ناز تھا، مولانا کی رفاقت پر نہیں، ادنیٰ خدمت گاری پر، جو فخر و مباہات کے ساتھ آپس میں چرچا کرتے تھے کہ آج مولانا نے ہم سے جوتی پر ٹونار کھوایا، انھیں نے وہ زبان درازیاں شروع کیں کہ شرافت کی آنکھیں نیچی ہو ہو گئیں اور متانت نے منہ پھیر پھیر لیا۔ دنیا بھر کا کوئی گندہ سا گندہ الزام نہ تھا کہ جو گندی سی گندی زبان سے اس پر نہ لگ چکا ہو، جو آج پھر کمال عزت اور انتہائی حمیت کے ساتھ "مرد مجاہد" پکارا جاتا ہے! "محمد علی" قلب نازک تر اور دماغ حساس تر رکھتا تھا کئی برس قبل اس ابتلا گاہ سے اٹھا لیا گیا۔ "بڑے بھیا" کو اپنے صبر وضبط کا زیادہ دعویٰ تھا امتحان گاہ میں سات آٹھ سال اور رکھے گئے!۔۔۔۔ دونوں بھائی دن میں خدا جانے کتنے الفاظ شمار وحساب سے خارج بول ڈالتے تھے۔ آخر زبان کے گناہوں کا کفارہ کیوں کر ہوتا! کارساز وبندہ نواز نے کیا خوب انتظام کر دیا۔ ادھر دل وجگر پر ہر روز نشتر و خنجر چلتے رہے اُدھر سارے گناہ ایک ایک کر کے دُھلتے رہے، قرب و رضا کے درجے ایک ایک کر کے بڑھتے رہے۔ یہ سمجھے کہ ہم مظلوم ہیں۔ غیب سے ندا آئی کہ مظلوم ہی یہاں مقبول ہیں!

بزرگوں نے کہا ہے کہ اللہ والا وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد پڑ جائے۔ شوکت مجذوب کی خصوصیت یہ تھی کہ شکل دیکھتے ہی اللہ اکبر کی آواز کانوں میں گونج جاتی! اللہ کے نام کو پکار پکار کر اتنی بار جپا، اللہ کے نام کی بڑائی اتنی بار خود پکاری اور دوسروں سے پکروائی کہ خود ہی اللہ اکبر کا ایک مجسمہ بن کر رہ گئے

تھے۔ اِدھر نمودار ہوئے کہ اُدھر نعرۂ تکبیر لگنے لگے! ـــــ کیا "ذکرِ جہر" کے سارے فضائل صرف خانقاہ نشینوں ہی کے حصہ میں آئیں گے اور جس کے ذکرِ جہر سے عالم کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا وہ محروم منہ دیکھتا رہ جائے گا؟ ــ

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

سنہ ۱۹۲۴ء میں خلافت ہی نہیں ٹوٹی، محمد علی کا دل بھی ٹوٹ گیا، اور برابر اور زیادہ ہی ٹوٹتا رہا۔ شوکت کی موت، خوب وقت کی منتظر رہی۔ اُدھر وہ ہستی اپنے مولیٰ کے حضور میں پہونچی۔ جس نے خلافت توڑی تھی[1] اِدھر وہ ذات بھی مخاطب ہوئی جو خلافت ہی کے نام پر تباہ ہو رہی تھی۔ پیشی اب اُسی آخری دربار میں ہو رہی ہوگی جس کے بعد کوئی دربار نہیں۔ اور فیصلہ اُسی عدالت سے ہو رہا ہوگا، جس کے اوپر کوئی عدالت نہیں کہ اجتہاد حق و صواب پر کس کا تھا۔ انک میت و انہم میتون۔ ثم انکم یوم القیامۃ عند ربکم تختصمون۔

کہتے ہیں کہ کرکٹ کی شہرۂ آفاق کپتانی کے زمانہ میں بیٹنگ بالکل بے تحاشا بے تکان اور بے پناہ تھی، گیند پر بلے کو اس زور و قوت سے مارتے کہ گیند وہاں پہنچکر گرتا جہاں کوئی فیلڈر تو کیا اُس کا وہم و گمان بھی نہ پہونچ پاتا۔ ۴۲ سال کی عمر کی یہ خصوصیت ۴۰ اور ۵۰ سال کی عمر تک قائم رہی ـــــ میدان کرکٹ کا نہیں، سیاست کا سہی، اس کپتان نے جب وار کیا، بے پناہ اور جب ہاتھ مارا تو اس زور و قوت کے ساتھ کہ ساتھی اور تماشائی دنگ اور حریف کے چہرہ کا رنگ فق!

باؤنڈری اور اُدھر باؤنڈری ہیٹ لگانے والے کپتان! زندگی کی طرح موت کی بازی میں بھی جیت تیری ہی رہی۔ جلوس زندگی میں ہزار ہا نکلے اور ایک سے ایک بڑھ کر پُر شوکت، لیکن آہ ۱۰ ر نومبر سنہ ۱۹۳۸ء کا جلوس میت!

[1] یعنی مصطفیٰ کمال اتاترک

کیا کسی دولھا کی بارات اس دھوم سے چلی ہوگی! کیا کسی رئیس کی سواری اس شان سے نکلی ہوگی! کیا کسی سیاسی لیڈر کو اتنے سوگوار نصیب ہوئے ہوں گے! دیکھ اے شوکت ملت! کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ کتنے سفید ریش پیر و خود اپنے کو آج یتیم سمجھ رہے ہیں کتنے جوانان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں۔ ہزار ہا ہزار کے اس مجمع سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں، شہروں میں، قصبوں میں دیہات میں، جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں، گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و درد مندی کے ساتھ برپا ہے۔ کروروں کی آبادی کس درد دل کے ساتھ تیرا سوگ منا رہی ہے! کتنے ایسے جنھوں نے کبھی تیری شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ آج اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا خاص انھیں کا گھر بے چراغ ہو گیا ہے!

شوکت علی کی موت تنہا ایک سپاہی کی موت نہیں، محض ایک جنرل کی بھی وفات نہیں، پوری ایک نسل کی موت، ایک مستقل دور کی خاتم ہے۔ شام ہونے لگتی ہے تو آفتاب کی حدت و تمازت پہلے دھیمی پڑتی ہے، پھر آفتاب کے چہرہ پر زردی چھانے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ قرص آفتاب پورا غائب ہو جاتا ہے۔ جب دور تجدد و انقلاب کے پھیلنے کا وقت آیا تو کسی کی حکمت کا ملہ مقتضی اس کی ہوئی کہ تہذیب محمدی کے علمبردار اور "اتحاد اسلامی" کے منادی، ایک ایک کر کے اٹھا لیے جائیں۔ پہلا بلاوا محمد علی کا آیا۔ پھر شاہ نادر غازی کی طلبی ہوئی، پھر اقبال کی پکار ہوئی اور اب اس عمارت کے آخری ستون کو بھی ہٹا کر راستہ بالکل صاف کر دیا گیا۔ شوکت علی آخری مسافر تھے، اس قافلہ کی آخری یادگار تھے، بقائے خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی (صاحب" کی اصطلاح میں پان اسلام ازم) کے اس آخری ستون کے گر جانے سے راستہ صاف ہو گیا، وطن کی پوجا کے لیے، سوشلزم اور کمیونزم کی خدائی

کے لیے، اور نئے نئے ناموں کے ساتھ طرح طرح کے آنے والے فتنوں کے لیے — محض جیل جانے والے، بلکہ تختۂ دار پر چڑھ جانے والے ابھی یقیناً بہت سے پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن ملت اسلامیہ کے فروغ و برتری کے لیے، دین الٰہی کی نصرت کے لیے اپنا کاروبار مٹا دینے والا، اپنی جاہ و مال دونوں کو ذبح کر ڈالنے والا اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لیے پیش کر دینے والا، اب کون اٹھے گا؟

وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ!

اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا الگ رہا، خود یہ تخیل قابل مضحکہ قرار پائے گا۔ اس پر آوازے کسے جائیں گے، اس پر ٹھٹھے لگائے جائیں گے، اور اس کا نام زبان سے نکالنا، تعزیرات ملک میں سنگین جرم ٹھہرے گا۔

شوکت اعظم! زہد و تقویٰ کا پیکر نہ تھا۔ اس راہ کا مسافر نہ تھا۔ مست و دیوانہ تھا۔ رند اور قلندر رہتا لیکن دیوانہ اپنے اللہ کے نام کا اور مست اپنے مولیٰ کے پیام کا۔ عمر بھر لڑتا ہی رہا۔ آج اس سے جنگ ہے کل اُس سے۔ اور دشمنوں سے زیادہ خود دوستوں سے لڑا۔ لیکن یہ ساری لڑائی بھڑائی، یہ سارا شوق جنگجوئی۔ اُسی محبوب کی خاطر جو ہر قدرت والے سے بڑھ کر قادر اور ہر توانا سے زیادہ توانا ہے۔ مدت ہوئی۔ میر تقی میر کا ایک شعر مثنوی زہر عشق کی دُھن میں ایک صاحب کو پڑھتے سنا تھا ؎

دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

الحمد اللہ کہ ایسے "شرابی" کا نمونہ دیکھنے میں بھی آگیا۔ اللہ کے نام کا ایسا مست اور متوالا۔ اب کون دیکھنے میں آئے گا! کس کا دل۔ اُمت محمدیہ کی درد مندی میں اتنا خون ناب نکلے گا؟

اور موت کے بعد رُوح تو اُدھر اعلیٰ علیین کو سدھاری، اور جسم کو جگہ کہاں ملی؟

ہے! حالی کا شعر مرثیہ غالب کا یاد کر لیجئے ؎

کس کو لائے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

جامع مسجد دہلی کے سامنے کا میدان، پشت کی طرف لال قلعہ، شاہان اسلام کی دنیوی عظمت و اجلال کی آخری یادگار، رُخ کی طرف مسجد کے در و دیوار گنبد و مینار شاہان اسلام کے دینداری کا نشان، سبحان اللہ و بحمدہ؟ اور پھر اپنے ہم مشرب ہم سرمست کا جوار، اللہ اکبر! شوکت مرحوم اپنی زندگی میں اپنے مدفن کے لیے خود کوئی جگہ تجویز کرتے تو اس سے بہتر اور کون سی ہوتی؟ خوش نصیب اور نامور کیریکٹر! فلاح اُمت و خدمت ملت کے میدان میں تیری پاؤنڈریاں اور اوور باؤنڈریاں قیامت تک زندہ رہیں گی اور تیری تربت پر وہ لوگ عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے جو زندگی میں تجھ کو آنسو دیتے اور تیرے دل و جگر کو داغہا داغ کرتے رہے۔ تیری تربت کے ذرہ ذرہ سے یہ صدا گوش دل سے سننے والوں کے کانوں میں آرہی ہے۔

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر!

(۷)

طبیب کی موت[۱]

صبح تھی ۵ ۲ دسمبر کی، اور وقت کوئی ۹ بجے کا، کہ خلقت کا ایک ہجوم، موٹروں سے اور گاڑیوں سے اور تانگوں سے اور سائیکلوں سے اُتر کر پیدل رواں نظر آیا، لکھنؤ کے ایک مشہور محلہ کی تنگ گلی میں۔ محلّہ جھوائی ٹولہ، شہر لیو رصوبہ کا مشہور دارالشفاء۔ دہلی کے بعد طب یونانی کا وہ ہمرادار لحکومت۔ مریضوں اور زندگی سے مایوسوں کا قبلۂ اُمید۔ آج سے نہیں، پشتہا پشت سے، اس وقت سے کہ جب کسی کے کان میں نام بھی نہیں پڑا تھا، کسی کے ذہن میں تصور کبھی نہیں آیا تھا وکٹوریہ ہاسپٹل کا، کنگ جارج میڈیکل کالج کا![۲] ——— مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگتے رہتے تھے، اور یہی وقت بھی ہوتا تھا۔ آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا، آج قدم اُٹھ رہے تھے افسردگی سے اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے۔ آج نبض دکھانی نہ تھی نسخہ لکھانا نہ تھا، سوال کرنا نہ تھا خود حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا، تدفین اُتارنا

---

(۱) صدق ۲ جون ۱۹۴۶ء ۲ اس وقت کے دو مشہور اسپتالوں کے نام

تھا۔ اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڑھے میں دفن کرنا، تربت پر فاتحہ پڑھنا! ـــــ طبیب موت کے پنجہ میں، چارہ گر قضا کے شکنجہ میں، تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں میں، لاتعداد نظیروں میں ایک اور کا اضافہ!

طبیب ابن طبیب ابن، حاذقوں کی اولاد، حاذق کے بیٹے، حاذق کے پوتے شفاء الملک حکیم عبدالحمید لکھنوی، محتاج نہ تعریف کے نہ تعارف کے، مشہور طبی درسگاہ تکمیل الطب کے روح رواں، ابھی خاصی صحت، سُرخ و سفید چہرہ، تندرست بشرہ ابھی اس مایوس کو دوا پلا رہے ہیں، ابھی اُس لبِ مرگ کو خدا کے حکم سے جلا رہے ہیں، کہ یک بیک خود بیمار پڑے، ذیابطیس اور پھر دق، بہار گئے اور آئے۔ علاج یہ ہوا اور وہ۔ اور انجام آخر وہی ہوا، جو اس کشمکش کا ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے جو علاج دوسروں کا کر رہا تھا خود اس کا مرض لاعلاج نکلا، جو داستان گوئی کے لیے مشہور تھا، پلک جھپکتے خود اُس کی زندگی ایک افسانہ بن کر رہی! طب کی کتابیں ازبر کر لینے سے کیا انسان آئی ہوئی گھڑی کے آگے پیچھے کر دینے پر کچھ بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے؟ دواؤں کے پہچان لینے، بیماریوں کا نام جان لینے، فن کی اصطلاحیں یاد کر لینے سے کیا مرگ و فنا کے قانون کی گرفت ایک ذرہ بھی ہلکی ہو جاتی ہے؟ کاٹھ کی پتلیوں کو کپڑے جیسے کے چاہیے پہنا دیجئے، نام بادشاہ، وزیر، کوتوال، فراش، بہشتی، دربان جو چاہیے رکھ دیجئے، قوت ساری کی ساری اختیار کُل کا کُل، کٹھ پتلی والے کے تار اور اس کی مشیت کے ہاتھ میں ہے۔ بازرق برق لباس والی، مختلف شاندار ناموں والی کٹھ پتلیاں بھی اس بے بسی کی درجہ میں شریک ہیں، اختیار اور قوت سے متعلق پردے کیسے کیسے پڑے ہوئے ہیں! بچے کس معصومیت کے ساتھ بادشاہ اور وزیر او نہ

- کیا کیا، اُن بتلیوں ہی کو یقین کئے ہوئے ہیں!

انتقال سے چند روز قبل، عیادت کا اتفاق چند منٹ کے لیے ہوا۔ چہرہ پر نور اور زیادہ آگیا تھا، گھلتے جاتے تھے اور رُوحلتے جاتے تھے۔ لب برابر ہل رہے تھے۔ نماز کی پابندی ساری عمر کی اور آخر عمر میں حج و زیارت، آخر بے نتیجہ تھوڑے ہی رہ سکتی تھیں، اور پھر بالکل آخر میں موت سے کچھ ہی روز قبل۔ ایک ولی کامل کی نظرِ عنایت و شفقت اور اُس کے ہاتھ پر بیعت! عیادت کا بڑا وقت اس بیعت پر مبارک باد دینے میں صرف ہوا ـــــ استغفار اور بیعت ایسے وقت میں جب کسی نئی معصیت میں مبتلا ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں، اور مجاہدات اضطراری ہیں کہ ساعت بساعت طے ہوتے جا رہے ہیں! اور مرشد کامل کی توجہ خاص اس پر مزید ـــــ حسنِ انجام کی پیش خبری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللھم اغفرلہ وارحمہ

---

(۸)

ماں کے قدموں پر[1]

ماہ مبارک ربیع الاول کی پندرھویں اور اپریل کی تیرھویں۔ اتوار کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور شب دوشنبہ شروع ہونے کو۔ وطن سے دور، پردیس میں، ایک اللہ کی بندی پر نزع کا عالم طاری ہے۔ لڑکی، لڑکوں، پوتوں، پوتیوں کا حلقہ زبانوں پر اللہ کا نام، اللہ کا کلام، اور توحید کا کلمہ۔ ادھر آفتاب غروب ہوا اُدھر روح پاک عمر کی ۸۵ سے زائد منزلیں طے کیے اپنے مالک کے حضور میں پہونچ گئی ——

—— میری جنت انھیں کے قدموں کے نیچے تھی۔ خوش نصیب تھا کہ اتنے عرصہ تک خدمت کا موقع پایا۔ بدنصیب ہوں میں کہ قدر اس نعمت کی ایک دن بھی نہ کی اور جو سب سے زیادہ مستحق خدمت کی تھی، اس کی خدمت کا حق ایک بار بھی ادا نہ کیا! حادثہ سخت، لیکن اپنی محرومی و بدنصیبی اس سے سخت تر:

نماز کی پابندی کا نہیں، نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دور کے اکابرین

---

[1] صدق۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۱ء

میں بھی بس چند ہی مثالیں ایسی ملیں گی۔ اشراق، چاشت، تہجد کا وہ اہتمام کہ ہم جیسوں کو تو فرض کے لیے بھی شاید ہی نصیب ہوتا ہو۔ یہ سن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موسم میں بھی ناغہ نہ ہونے پائے۔ گرمیوں کی مختصر راتیں کہ فجر تک بھی نیند پوری ہونی مشکل یہ ابھی لیٹی نہیں کہ ابھی تہجد کے لیے اٹھ بیٹھیں۔ چلّے کے جاڑے پڑ رہے ہیں۔ صبح ہونے پر لحاف کے اندر سے نکلنا دشوار اور یہ رات کے ایک بجے اور دو بجے اور تین بجے، تہجد کے لیے وضو کر رہی ہیں، عزیزوں میں کوئی پردیس سے آیا، کوئی بیماری سے اچھا ہوا، کوئی امتحان میں پاس ہوا، غرض کسی قسم کی بھی خوشی ہوئی اور انھیں نماز شکرادا کرنے کا گویا حیلہ ہاتھ آگیا۔ آئے ہوئے عزیز سے ملیں گی بعد کو، نماز کو پہلے کھڑی ہو جائیں گی۔ کسی کے انتقال کی خبر سنی اور جھٹ کچھ رکعتوں کے ایصال ثواب کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جتنی رکعتیں پڑھ ڈالیں، ان کا علم تو بس اللہ کے فرشتوں ہی کو ہوگا۔ محلّے کی، شہر کی جو عورتیں ملنے ملانے آتیں، اُن پر تبلیغ نماز کی کیا کرتیں۔ خدا جانے کتنوں کو نمازن اور بعد کو تہجد گزار بنا دیا۔ نماز ہی کا سا عشق نماز کی پکار یا اذان کے ساتھ تھا۔ پردیس میں اگر مکان ایسا مل جاتا جہاں اذان کی آواز صاف آتی تو باغ باغ ہو جاتیں۔ وطن میں رہتیں تو گھر کے صحن میں، یا ڈیوڑھی میں برابر اذان دلاتی رہتیں۔ کئی سال قبل سے کہہ رہی تھیں مرنے کے بعد جی تو یہی چاہتا ہے کہ مسجد کے عین دروازہ پر دفن ہوں کہ اللہ کے گھر کے آنے جانے والے میرے اوپر سے گزرتے رہیں۔ اور خیر، یہ ممکن نہ ہو تو میری قبر مسجد سے متصل ہی بنے کہ اذان کی آواز برابر آتی رہے۔ نماز و اذان کے بعد نمبر روزہ کا تھا۔ نذر کی، نفل کی، اور بہت کثرت کی، اور دوامی کی، یہاں تک کہ پچاسی سے گزر گئیں، اور فرض روزہ تو کیا کوئی چھوٹنے پاتا، عاشورۂ محرم اور عرفۂ ذی الحجہ اور پندرھویں شعبان کے روزے، دوسروں کو بھی ساتھ لے کر، ترک نہ ہونے پاتے، جوان جوان ہمت

وعزیمت کی یہ مثالیں دیکھ کر دنگ رہ جائیے۔ حج اپنے شوہر مرحوم کے ساتھ ۱۳-۱۹۱۲ء میں
کرآئی تھیں اور کفن کا کپڑا، آب زمزم سے دُھلا ہوا، اُسی وقت سے سفر و حضر میں ساتھ
رکھنے لگی تھیں۔ زیارتِ مدینہ اور دوبارہ ادائے حج کی تمنا عمر بھر رفیق رہی۔ نماز
کی طرح ادائے حج کی بھی تبلیغ پاس بیٹھنے والیوں کو کیا کرتیں۔ خیر خیرات، داد و دہش
کی تو کہنا چاہئے، پُتلی تھیں۔ ہم لوگوں کے بچپن میں بارہا یہ ہوا کہ گھر میں میٹھا آیا
یا موسمی پھل بہت سے آئے اور ہم خوش ہوئے کہ کئی دن تک خوب کھائیں۔ ذرا دیر میں
دیکھا تو سب تقسیم ہو چکا تھا! اب بڑھاپے میں یہ تھا کہ دسترخوان پر کوئی مخصوص چیز
لائی گئی گھر کی انھیں سفط کی خاطر اور اُنھوں نے جھٹ اُٹھا، دوسروں کو بھجوا دی۔

اُردو کی شُدبُد معمولی سی تھی، وہ بھی اب بھول بھال گئی تھیں۔ قرآن مجید ناظرہ
پڑھی ہوئی تھیں، زیادہ رواں وہ بھی نہ تھا، اور اب تو ضعف بصارت کی بنا پر اور
زیادہ اٹکنے لگی تھیں، لیکن ہمت میں ذرا سا فرق نہیں، وہی شوق، وہی دُھن،
جلی حروف کا قرآن لے کر بعد اشراق بیٹھ جاتیں، ایک ایک سطر نکالنے میں ایک
ایک منٹ لگ جاتا اپنی ہار بھلا کبھی بھی ماننے والی تھیں۔ مذہبی کتابیں اخیر عمر میں
اپنی پوتیوں سے پڑھوا کر سنا کرتیں، قویٰ بجز شدید گراں گوشی کے عام طور پر آخر
تک اچھے رہے۔ بے تکلف چلتی پھرتیں، کوٹھے پر چڑھتی اترتیں، دعا بھی اس کی کیا
کرتیں کہ یا اللہ ہاتھ پیر آخر تک جواب نہ دیں۔ ہاتھ میں ذائقہ تھا، کھانے کی
مخصوص چیزیں کچھ روز پیشتر تک کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے پکاتی رہتیں۔ اور عینک لگا کر
سیتی پروتیں۔ کپڑے اپنے ہاتھ سے گویا بالکل آخر تک قطع کرتی رہیں، اِدھر
کئی سال سے اکثر اسی موسم میں بیمار نزلہ و بخار میں ہو جاتیں، اور چند روز بعد اچھی
ہو جاتیں۔ اب کی بھی دھوکا یہی رہا۔ خیال سن کی طرف گیا ضرور، لیکن نفس نے
جواب یہ سمجھا دیا کہ ان کا سن تو ابھی کچھ کم ہے، اُن کی ایک بڑی بہن کی عمر ۹۵ سال

کی ہوئی تھی! اُن کی والدہ کی تو اس سے بھی زائد! اور پھر سعالجین کی اطمینان دہی اس پر مستزاد! غرض یہ کہ آنکھوں پر پردے غفلت ہی کے پڑے رہے اور ساعت موعود تو جب آتی ہے، ایسے ہی دبے پاؤں اور زیر نقاب آتی ہی ہے! آہ نادان انسان اور اس کے غلط اندازے!

"بھیا، اب سورۂ یٰسین پڑھ دو" یہ آخری الفاظ تھے، جو اس چاہنے والی، ناز اٹھانے والی ہستی کی زبان سے میں نے سنے۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ اب اس کے بعد کوئی اور پوری بات اس محبت والی زبان اور شفقت والے ہونٹوں سے سنا نصیب ہوگا۔ کم نصیب کے نصیب میں نہیں۔ تعمیل ارشاد میں یٰسین شریف ایک نہیں دو بار پڑھ کر دم کر دی۔ عارضی سکون ہوا، چہرہ پر بحالی آئی لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی۔ نماز، وضو، تیمم کی فرمائش ادھ کٹے لفظوں یا ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ برابر جاری رہیں۔ ہاتھ اٹھاتی ہیں، کانوں تک لے جاتی ہیں ——— اللہ کے کلام الذین ھم فی صلاتہم دائمون۔ کی تفسیر کتابوں اور روایتوں کی مدد کے بغیر ایک نئے رنگ میں شاہد ہو رہی ہے!

اللہ کی بندی کا سابقہ اپنے مولیٰ سے تھا۔ بیٹے اور پوتے پاس کھڑے پکار رہے ہیں اور کوئی جواب نہیں ملتا! یا اللہ! اتنی بے رحمی تو زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھی تھی! چہرہ دُھلے کپڑے کی طرح یک لخت سفید، خون کی چھینٹ نام کو نہیں، بس نور ہی نور، حالت منٹ منٹ پر کچھ سے کچھ ہوتی گئی۔ تنفس تیز سے تیز تر ہو گیا، نبض کا نظام بگڑ گیا۔ آنکھ کی پتلیاں جم کر رہ گئیں، ناسوت کے رشتے ٹوٹنے لگے، برزخ کے دریچے کھلنے لگے، حلق نے دوا پانی سے انکار کر دیا، بجز آب زمزم کے! اللہ کی کریمی کے قربان کہ اس کے قطرے آخری وقت بھی اتر گئے

چارپائی قبلہ رُخ کر دی گئی ہاتھ پیر برابر کر دیئے گئے، اس نامۂ سیاہ نے سورہ یٰسین آخری بار پڑھنی شروع کی، جب آیۂ کریمہ سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ آئی، جی نہ مانا، بار بار اس کی تکرار اپنا منہ کان کے قریب لے جاکر کی، ادھر زبان پر فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ آیا، اُدھر رُوح پرواز کر گئی۔ شاید اُسے انتظار ہی اس بشارت کا تھا!

موت کے کچھ دیر بعد میں نے ہاتھ چھو کر دیکھے، اُنگلیاں اب تک نرم تھیں یہ وہی ہاتھ ہیں جو داد و دہش میں کیسے کھُلے ہوئے تھے، اور نماز کے وقت کیسے بندھے ہوئے رہتے تھے! زمزم میں ڈوبا ہوا کفن اسی گھڑی کے انتظار میں ۹۷ برس سے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا، آج کام آیا غسل، بیٹی، بہوؤں اور پوتیوں نے مل کر دیا پردہ کے باہر سے ہم لوگ ہدایات دیتے رہے اور لوٹوں میں پانی بھر بھر کر دینے سے گویا خود بھی غسل میں شرکت کر لی۔ غسل و کفن کے بعد نعش ایک آرام دہ موٹر لاری پر وطن لائے۔ دفن کے لیے جگہ خاندانی مسجد سے بالکل متصل ملی۔

اے اللہ کی بندی، تیری عمر بھر کی آرزو پوری ہوئی۔ اذان کی آواز کے ساتھ تجھے عشق تھا۔ اب جی بھر کر یہ آواز قیامت تک سُنے جا۔

نماز جنازہ اسی نامۂ سیاہ نے پڑھائی۔ جنازہ میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے، سب کو معلوم ہے اُن اذکار و ادعیہ کے ساتھ ساتھ زیر لب تقریباً یہ مناجات بھی جاری رہی اے مالک و مولیٰ! آج تیرے حضور میں وہ بندی آرہی ہے، جس نے ۵۰ سال کی عمر تک روزہ حتی الامکان قضا نہیں ہونے دیا۔ نماز ایک وقت کی بھی ناغہ نہیں ہونے دی، تیری مخلوق سے محبت کرتی رہی، خود بھوکی رہ کر کھلایا۔ دوسروں کو پہنایا، جو پایا آس پاس والوں کو شریک کیا، مئی، جون کی گرمی اور تپش میں روزے رکھے، دسمبر، جنوری کی کڑکڑاتی راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھی

عزیزوں کی، قریبوں کی، بستی والوں کی غمخوار تھی، تیرے نام کی عاشق، تیرے رسولؐ کے نام کی دیوانی تھی، گواہی دیتا ہوں کہ اس نے میرے ساتھ دنیا میں جو آخری کلام کیا وہ تیرے ہی کلام کے پڑھنے کا حکم تھا! آج ہوا میں اُس کے نام پہ ماتم کر رہی ہیں اور یتیم اس کے لیے سر پیٹ رہے ہیں، اُس کی موت اس مہینہ میں آئی جو تیرے رسولؐ برحق کی وفات کا مہینہ ہے جس وقت آئی جب شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی، اُس مرض (بخار) میں ہوئی جسے تیرے رسولؐ نے شہادت کی موت بتائی ہے، پھر پردیس میں ہوئی جو تیری رحمت کو جوش میں لانے کا ایک ذریعہ ہے، ابدی نیند کی جگہ اُس نے ڈھونڈ ھ کر تیرے گھر کے جوار میں اس طرح پائی کہ تیرا نام اس کے کان میں پڑتا رہے، تیری رحمت تو کسی سہارے کسی بہانے کی محتاج نہیں، اس کے لیے تو اپنے بہانے موجود ہیں۔ اے میرے اور اس کے دونوں کے کریم و شفیق آقا! اس کی لغزشوں سے درگذر کیجیو، اس کی خطاؤں پہ خط عفو پھیر دیجیو، اس کے حسنات کو بڑھائیو اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیجیو جو شایان شان ہو، تیری رحمت کے، تیری صفت ستاری کے، تیری شان غفاری کے!

احباب کرام مجھے تعزیت نامہ لکھنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ اللہ ہی سے دعائے مغفرت و ترقی درجات کریں اور ایصال ثواب اگر بلا تکلف و زحمت کر سکتے ہوں تو اپنے ہی مقام پر کر دیں۔!

---

(۹)

سر سکندر حیات[1]

سر سکندر حیات خاں مرحوم کی ختم حیات کی خبر آپ نے اخبارات میں پڑھ لی؟ ماتم کی صدائیں جو ملک بھر میں گونجیں، وہ بھی سن لیں؟ صوبہ اور پنجاب جیسے زبردست صوبہ کے وزیر اعظم تھے۔ اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے سارے ہمعصروں سے بڑھ چڑھ کر، تدبر و فرزانگی میں لاجواب، سوجھ بوجھ میں، فہم و دانش میں اپنی نظیر آپ۔ عملاً وزیر نہیں، تاجدار تھے، نائب نہیں خود مختار تھے۔ ماتحت نہیں سالار تھے، بڑھ چکے تھے، بڑھ رہے تھے، اور خود تو بڑھ ہی رہے تھے، اوروں کو بھی بڑھا رہے تھے۔ اچانک اور حسرت ناک موت کی خبر سننے کے لیے دوست دشمن کوئی بھی تیار تھا؟ اس کا گمان بھی تھا؟ اچھے خاصے ہٹے کٹے تندرست، قد آور مضبوط، چہرہ گل تر کی طرح شگفتہ، صحت فصل بہار کی طرح شاداب و تازہ۔ موت عین شادی کے گھر میں، عین شادمانی کی گھڑیوں میں آئی! بڑے نور نظر اور چھوٹے لخت جگر کے سہرے کے کھلے ہوئے پھولوں کو روندتی ہوئی، ہنستی ہوئی،

---

[1] صدق ۱۸ فروری ۱۹۴۳ء

چلتی ہوئی۔ پھر کوئی جنگل بیابان نہیں، گاؤں اور دیہات نہیں، لاہور جیسا مرکز تمدن، بہتر سے بہتر حکیم، حاذق سے حاذق ڈاکٹر، بلانے کے لیے ٹیلیفون آنے کے لیے موٹر، سکنڈوں میں خبر گئی، منٹوں میں ڈاکٹر آئے، موت کے فرشتوں کی رفتار دونوں سے تیز تر نکلی —— جو ہستی مجسم حیات تھی جس کی رگ رگ میں زندگی اور قوت کی تیز نبضیں اچھل رہی تھیں، آناً فاناً بجھ گئی، ختم ہو گئی۔ قبل اس کے کہ علاج نہ تدبیر کوئی ادنیٰ بھی ہو سکے!

دنیا ایک بڑی اور اسی سکندر نام کی شخصیت سے بھی واقف ہے۔ اقبالمندی اور دنیوی خوش قسمتی کے لحاظ سے ان مرحوم سے بھی کہیں برتر، وہ دنیا کا فاتح اعظم تھا۔ سارا یونان فتح کیا، ایران کو مسخر کیا، دارا کے تخت کا تختہ الٹ دیا، عراق میں، توران میں اپنا جھنڈا لہرایا، خراسان کو، شمالی ہندوستان کو زیر کیا بلخ کو، بخارا کو، ترکستان کو تابع فرمان کیا عین زمانہ شباب میں، عالم مسافرت میں خود اپنا وقت موعود آپہونچا۔ تو زندہ آوری ختم تھی۔ اور ساری کوششیں، تدبیریں بے اثر۔ مقررہ گھڑی، ایک سکنڈ کے لیے، ایک سکنڈ کی باریک سے باریک کسر کے لیے، نہ آگے بڑھ سکی، نہ پیچھے ہٹ سکی!

جاہ وحشم کی خوش تدبیری، طبیبوں کی حذاقت، تیمارداروں کی دردمندی اگر کہیں نفع پہونچا سکتی تو ماضی میں سکندر یونانی اور حال میں سکندر پنجابی یقیناً موت کی گرفت سے باہر رہے ہوتے! غفلت کے بند و عبرت کی آنکھ اب بھی بند ہی رکھو گے؟ خودی کے متوالو! ہوش اب بھی نہ آئے گا۔؟ سکندر مقدونی کا انجام تو اللہ کو معلوم، سکندر پنجابی کا حال اللہ کے کرم سے ہم پر آپ پر سب پر روشن ہے، الحمد للہ کہ مسلمان تھا، ہمارا بھائی۔ توحید کا قائل، رسالت

رسالت کا معتقد، اسلام کا کلمہ گو، محمدؐ کی اُمت میں شامل، نماز کا پابند، روزہ کا شدت سے پابند۔ کلام الٰہی کی اشاعت کا ساعی، اپنی بصیرت کے مطابق اُمت محمدیؐ کی فلاح کا داعی۔ اپنے کو عمر بھر مسلمان کہا مسلمان سمجھا۔ اور ظرف، ماحول، بساط کے موافق، اپنے کو مسلمان بنایا اور رکھا۔ فیلڈ مارشل ویول کے پیام، رائٹ آنریبل چرچل کے سلام، فوج کی سلامیاں، لاٹ صاحب کے ہاں کی حاضر باشیاں، سب جسم کی کثافتیں تھیں، یہیں زیر زمین دفن ہوگئیں۔ روح عرفانی لطافتوں کے پانی سے دُھل کر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک ہوئی اور ان قیدوں سے آزاد، ایمان کے بازوؤں سے چڑھی اور یقین و اعتقاد کے پروں سے عالم بالا کی سمت میں بلند ہوئی، ہزار ہا دل والوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ ہزاروں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی!

۱۰

نئی نویلی[1]

وہ ابھی بالکل نوجوان تھی، شادی کو ابھی پورا سال بھی کہاں گزرا، دس ہی گیارہ مہینے تو ہوئے، قریبی رشتے سے میری بھتیجی تھی، اردو ترجمۂ قرآن پڑھنے میں شاگرد بھی۔ بڑی مذہبی، بڑی صالح، نماز کی عاشق، روزے کی شیدائی، سب کی ہمدرد و غمخوار، بڑی مخلص، بڑی خدمت گذار، بچہ، ہنستا کھیلتا پیدا ہوا۔ دوسری رات کو بیمار پڑی اور تیسری صبح کو قبل اس کے کہ آفتاب اپنے پورے عروج پر پہونچے اس کی عمر کا آفتاب غروب ہوگیا! انا للہ۔ زچگی کی موت شہادت کی موت ہے، سچے کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا، پھر دفن کے وقت شب جمعہ شروع ہوچکی تھی۔ زبان پر آخر تک یا اللہ، یا رحمٰن یا رحیم رہا۔ دوسروں سے سورۂ یٰسین فرمائش کرکے پڑھوائی، مرتے چہرے پر بجائے مردنی اور بے رونقی کے رونق اور تازگی، آنکھیں ذرا کھلی رہ گئیں، اُن سے بجائے بدنمائی کے اور خوشنمائی اور زیبائی! نام ایک پیمبر زادی کے نام پر رقیہ تھا۔ قبر میں باپ نے اُتارا یہ نہ پوچھئے کس دل سے! — اُس

[1] صدق ۹ر مارچ ۱۹۴۴ء

جواں مرگ پیمبر زادی کو بھی تو قبر میں اتارنے والے اس کے والد ماجد اور اللہ کے محبوب ترین پیمبر تھے ـــــ اللہ اللہ اُمت کا باپ اپنے فرزندوں کو، سخت سے سخت مصیبت کے وقت کیسے کیسے سبق تسلی اور تعزیت کے اپنی زندگی سے دے گیا ہو!

موت کا وقت عجب پُر اثر، پر درد تھا، لکھنؤ کے ایک بڑے حاذق طبیب، بورڈ آف میڈیسن کے پرانے ممبر اور شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز، جو اتفاق سے عزیز قریب بھی تھے، ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی آنکھوں کی پتلیوں کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے آثار کچھ باقی بھی ہیں! ـــــ گویا یہ تدبیریں موت کے فرشتہ کا ہاتھ پکڑ لیں گی! ـــــ ماں کی دلدوز آہیں اور دعائیں! کس قلم کے بس میں ہے کہ مصوری ماں کے رنج کی کر سکے؟ لیکن رنج بحمد اللہ مسلمان ماں کا تھا۔ ادھر غش سے اٹھی ادھر سلسلہ پھر دعا و مناجات کا کلمہ قرآن کا شروع ہوگیا۔ اے اللہ تیری امانت تیرے سپرد، نعمت تو ہی نے دی تھی، تو ہی نے اسے واپس بھی لے لیا! ـــــ مسلمان عورت جنت بھی کتنے طریقوں سے لے سکتی ہے!۔

جسم رنجور، روح مسرور۔ اب کوئی نہیں پہچان نہیں پڑتا؟ مرنے والی نے ہراس و اضطراب سے نہیں، سکون و اطمینان سے کہا، سکرات شروع ہو چکا تھا۔ بصارت اپنا عمل چھوڑ چکی تھی اور مٹا زبان بھی بند ہوگئی، ہونٹ دوبارہ اللہ اللہ کہنے کے لیے ہلے۔ اور ایمان والی کی روح راضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً کی بشارت پہ دوڑتی ہوئی روانہ ہوگئی!

اللہ کی جو بندی اپنے مولیٰ کی یاد سے کسی حال سے غافل نہ ہوئی تھی جس نے ذکر شادی کے نغموں اور رخصتی کے ہنگاموں میں بھی قضا نہ ہونے دیا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ مولا کی یاد اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی! کوئی اُس

۔ کی یاد کی طرف دوڑکر دیکھے تو، وہ یاد خود کب اس کا پیچھا چھوڑتی ہے؟ ــــ
فَاذکرُونی اَذکرکُم کی ایک نئی تفسیر، عملی رنگ میں!

---

(۱۱)

قائد ملت[۵۱]

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے ، ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال یہ آیا کہ موت آج ہی کل میں اگر آگئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کا دل چاہتا ہے ؟ نام کئی ایک ذہن میں آئے لیکن سب سے پہلا نام جو ذہن میں آیا وہ اسی مجاہد اسلام ، بہادر خاں حیدر آبادی کا تھا ، کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے ، پھرتے پھراتے عین اس وقت اتفاق سے لکھنؤ آموجود ہوتے ! ایسا کیوں ہونے لگا ۔ لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں ! —— یہ تھی اس نامہ سیاہ کے دل میں اس شیر دل مجاہد ملت کی محبت ، عظمت اور عقیدت !

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جا رہی تھیں ، کیسے وہم گزر سکتا تھا کہ وہ یوں دھوکا دے جائے گا ! اور جس کی دعاؤں کے لیے یہ طلب و تمنا تھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہو جائے گا ! —— آہ مشت خاک انسان ، اور اس کے تار عنکبوت جیسے بودے ، پھسپھسے ، کمزور ارادے ، حوصلے ، سہارے !

---

۵۱ صدق ۱۰ر جولائی ۱۹۴۴ء

۹۰سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی! اور پھر کیسے تندرست و توانا، ہنس مکھ اور خوش مزاج۔ خوش سیرت، خوش صورت، بلا کے ذہین و نکتہ رس۔ کس بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول، چمن بھر کو مہکاتا ہوا۔ بات کی بات میں نذرِ خزاں ہو جائے گا؛ محفل بھر کو منور رکھنے والی شمع اِسی لمحہ، اسی آن بجھ جانے کو ہے! ـــــــ کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی، نہ سکرات کی تکلیفیں نہ نزع روح کی سختیاں۔ اور کیوں ہوتیں؛ جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کی ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنا لیا تھا، اس کی روح پکارنے پر مثالِ لبیک آخر کیوں نہ کہتی؟ تاخیر و تامل کی؛ جو ایک منٹ کے لیے بھی آخر اُسے کیا ہو سکتی تھی؟ ـــ رہبر دکن والے، رہبر ملت کی ۱۰-۲ سال قبل کی فوری موت کا راز بھی اب کچھ کچھ سمجھ میں آیا۔ جو دُنیا میں نقیب تھا، اس سے آخرت میں بھی نقیب ہی کا کام لیا گیا۔ اور عجب کیا کہ جو دنیا میں خدمت ملت کے دیوانے اور فلاح امت کی خاطر ایک دوسرے کے دست و بازو، رفیق، ہمراز و دمساز تھے، انھیں جنت میں بھی اُن کی خواہش پر یہی مشغلہ تفریح دیدیا گیا ہو! جو یہاں محمدؐ کے دین کا سودائی تھا، عجب کیا جو جنت کی ہوائوں نے اس کو تیز سے تیز تر کیا ہو!

حیدرآباد کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ جس نے آج سے ۱۰-۲۲ سال قبل کیا ہے، وہ آج ان حیدرآبادیوں کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ اتنے دنوں میں ان کی کایا پلٹ کس نے کر دی؛ جو قوم سرتاسر بے عمل، مجہول، افسردہ، منتشر اور پست مذاقی اور بد نظمی کا شکار تھی، اس میں عمل، تنظیم، انقباض کی برقی رو کس نے دوڑا دی؛ یہ مردوں کو زندہ کر دینے والی مسیحائی کس نے کر دکھائی؟ حیدرآبادی مسلمان، شمالی ہند کے مسلمانوں کے سامنے شرم سے نہیں فخر سے پیش ہو سکے،

ئہ مولوی احمد محی الدین مرحوم ایڈیٹر رہبر دکن (حیدرآباد دکن)

یہ قلب ماہیت کس نے کر دی ؟ اور جو دکن ، اجتماعی اور ملّی زندگی میں سبق لینے کے قابل بھی مشکل سے تھا اُسے سبق دینے کے قابل کس نے بنادیا ؟ سارا کارنامہ ، (قلم لکھنے چلا تھا کہ اعجازی کارنامہ) اسی مرنے والے زندہ جاوید بہادر خاں اور اس کے چند مخلص رفیقوں ہی کے اعمال ناموں میں لکھا جائے گا ـــــــ " قائدِ ملّت " جس کسی نے اُسے کہا اُس نے کوئی شاعری نہیں کی ۔ ادبی صنعت گری ، لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ، ایک حقیقت بیان کر دی ، تاریخ کی طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث ، ریاضی کے اعداد کی طرح اٹل کھری ۔ قائدِ ملت ! اور آج یہ لفظ پہلی بار مصدق استعمال کر رہا ہے) کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوتا تو محمد علیؒ کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا ۔ ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا ہوتا ، تو وہ یہی تھا ، وہی اخلاص ، وہی دینی جوش ، وہی تڑپ ، وہی سوجھ بوجھ وہی نبض شناسی ، وہی ہمت و عزم ، غرض بجز محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے اور سب کچھ وہی ! ـــــــ لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آتی (" سننا " اس لیے کہ شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی اکلی تک نہیں ہوا) دل کو برابر یہی اطمینان رہتا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرا کے رہے گی ۔

۲۲ ر اکتوبر ۱۹۴۱ء مقام علی گڑھ ۔ یونیورسٹی کی مجلس تاریخ و تمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب دونوں کا بیان ہونے والا تھا ۔ نواب سحر بیان کی خطابت بچہ بچہ سے خراج تحسین حاصل کئے ہوئے ، اہل جلسہ نے غلطی اور شدید غلطی کر کے مجھ جیسے ہیچ مدان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ ہی رکھ دیا ۔ نہ سب اور ملی زودی اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک کھچا کھچ بھرا ہوا ۔ سامنے جولاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا ، اس نے جواب دیا ۔ اب بھلا میری آواز کیا پہنچتی ۔ ایک صاحب

نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔ کچھ سنائی نہیں
دیتا اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی ہٹنے پر آمادہ تھا۔
فوراً صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا مگر نواب کھڑے ہو گئے
اور گرج کر بولے۔ کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے بیان
کو اوّل سے آخر تک سنوں گا، میں تو انھیں کا لکچر سننے کو آیا ہوں۔ اور جب تک وہ
اپنا لکچر ختم نہ کر لیں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا شروع نہ کروں گا؟
مجمع پر سناٹا چھا گیا! ـــــ ہے کہیں اس دور میں اس شرافت کی مثال؟

۹ اپریل ۴۲ء لکھنؤ۔ نواب یوم اقبال کی صدارت کر کے ندوہ میں، ڈالی
باغ میں، گنگا پرشاد میموریل ہال میں، متعدد جلسوں میں معرکہ کی تقریریں کر کے
صبح کی گاڑی سے براہ دہلی حیدرآباد واپس جا رہے ہیں۔ میں صبح ۸ بجے ان کی قیامگاہ
پر پہنچا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی۔ موٹر
اسٹارٹ ہوتا ہے۔ ادھر نواب کی زبان دعاؤں پر کھلتی ہے، سواری پر سوار ہونے کی
دعا ہو گی ابھی ختم ہوئی جاتی ہے۔ لیکن یہ کیا؟ کہاں ابھی ختم ہوئی۔ دو سکنڈ، چار سکنڈ،
بیس سکنڈ۔ ایک دعا، دو دعائیں، سلسلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے آتا۔ اور دعائیں
زیادہ تر حدیث کی۔ یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین کی قسم کی کوئی کتاب!
شرم سے کٹا جا رہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم اور مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں۔
یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی نہیں یاد ان کا ورد سفر تک میں رکھنا تو خیر الگ رہا،
یہاں تو یاد بھی نہیں! اب انتظار کہ نواب کا خشوع و خضوع کچھ کم ہو لے، تو ادھر
اہل دنیا کی کچھ زبان کھلے۔ مگر تو یہ اس کا موقع ہی کیوں آنے لگا تھا۔ دعاؤں کا
سلسلہ نہ ختم ہونا تھا، نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اسٹیشن آ گیا! ـــــ ایک مولانا
عبدالباری فرنگی محلی کو مستثنیٰ کر کے اور کسی لیڈر کی چاہے وہ آل انڈیا ہوں یا

صوبہ دار، مذہبی اعمال میں مصروفیت کی ایسی مثال تو نہ اس کے قبل اپنی آنکھوں نے دیکھی تھی نہ اس کے بعد۔

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

خوش نصیب قبر، خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لیے اللہ کے دین کا دلیر و باہمت سپاہی آرہا ہے۔ وہ غریبوں کا سہارا تھا، بیکسوں کا والی تھا۔ ملت کا پشت پناہ تھا، نہ وہ ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اور مجھ سے ان سے پہلی ملاقات جب حیدرآباد میں غالباً ۱۹۲۹ء میں میرے عزیز ترین دوست او رمیزبان مولوی سید امین الحسن بسمل سوہانی مرحوم کے مکان پر مولانا عبدالرحیم صاحب (سابق انجمن اسلامیہ والے اور حال تفسیر القرآن والے) کی وساطت سے ہوئی تھی، تو میں بس اس قدر سمجھا تھا کہ ایک خوش مذاق وعلم دوست نوجوان رئیس ہیں! (ان کے نفیس موٹر کی چمک دمک آج تک یاد ہے) دل و دماغ روح وضمیر کے یہ حیرت انگیز اور قابل صد رشک جوہر تو رفتہ ہی رفتہ کھلے۔

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو؟ کیسے کیسے باغی وطاغی، غدار و سرکش، اسی بچاسی سال کی عمروں کے پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، اور یہ مطیع وفرمانبردار بندۂ دین کا سپاہی اور راستی کا علمبردار، ۴۸ سال کی عمر ہی میں واپس بلالیا جاتا ہے!

سچ کہا اس عارف نے جس نے یہ کہا ہے

ما پرور یم دشمن و ما می کشیم دوست کس را رسد نہ چون وچرا در قضائے ما

روایتوں میں آتا ہے کہ خلیفۂ برحق عمر فاروقؓ نے جب عین میدان قتال میں خالد سیف اللہ کو معزول کر دیا تو ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ لوگوں کا تکیہ

حق تعالیٰ سے زیادہ خالد پر ہو چلا تھا، اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ فتوحات جو حاصل ہو رہی ہیں یہ خالد کی شجاعت و تدبیر کا نتیجہ ہیں، میں اس خیال کو مٹا دینا چاہتا ہوں — عجب کیا، جو ایک مصلحت کچھ اسی طرح کی اس جوانمرگ قائد ملت کی موت میں بھی ہو! ملت بہت زیادہ تکیہ اس بندۂ حق پر کر چلی تھی اور مشیت تکوینی کو سبق یہ دینا منظور ہو کہ جو خدائے قادر و توانا، ایک بندہ کے توسط سے نصرت و کامرانی پر قادر ہے، وہی اُسی واسطہ کے بغیر بھی، اُسی طرح قادر و متصرف ہے!

---

(۱۲)

ہمشیر کی رخصتی

ہمشیر ایک ہی تھیں، بہن میں ۴۔ ۵ سال بڑی۔ عمر میں ۶۰ کے اندر۔ عابد اور صالحہ ایسی کہ دور دور تک مثال ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ حاجیہ، تہجد گزار، نماز و تلاوت کی عاشق، غیبت و بدگوئی، لڑائی جھگڑے سے ناآشنا۔ ایک ایک کی ہمدرد و غمخوار۔ ۲۵ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں اولاد کوئی نہ تھی۔ وسط اپریل میں لکھنؤ میں بیمار پڑیں، اور بیماری کے وہ شدائد کہ الاماں، آہ، وہ تیمارداری کی راتیں! کبھی مایوسی کی تاریکیاں، کبھی اُمید کی ہلکی سی شعاعیں! ابھی قرآن مجید پڑھ پڑھ کر سنایا جا رہا ہے۔ رو رو کر دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔ اور ابھی غفلت بھرا اُمید دن کے خواب دکھانے لگی! پورا ایک ہفتہ موت و حیات کی کشاکش میں گزرا سورۂ یٰسین دن میں بیسیوں بار پڑھی جاتی رہی اور دوا سے زیادہ استعمال آب زمزم اور شہد کا رہا۔ اپریل ۴۵ء کی ۲۲ تھی اور جمادی الاولیٰ کی ۵ر۔ کہ دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا، اور جو ما بر وشاکر بندی شاید

لہ صدق ۷ر مئی ۱۹۴۵ء

جنت ہی کے لیے بنی تھی، جنت کے سفر پر روانہ ہوگئی! یہ غم نصیب ناکارہ سورہ یٰسین سنا رہا تھا، اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپکا رہا تھا گزرنیوالی کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے دیکھے گئے، اور کمرہ رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کی صداؤں سے گونج اٹھا! —— موت شاید ہر مومنہ کی یوں ہی ہوتی ہے! غسل کے بعد چہرہ پر رونق تھی، معصومیت تھی، کوئی اثر نہ ضعف کا نہ مرض کے شدائد کا! —— ایسا پر رونق و شاداب چہرہ شاید زمانۂ شباب میں ۳۰۔ ۳۵ سال قبل رہا ہوگا! نماز جنازہ لکھنؤ کے مشہور عارف باللہ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری نے پڑھائی۔ کئی دن قبل سے دعاؤں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ جماعت میں شریک مولانا محمد اسلم فرنگی محلی مولانا عبدالباری ندوی (خلیفہ مجاز حضرت تھانویؒ) مولانا محمد عمران خاں ندوی اور دوسرے صالحین تھے۔ مولانا محمد شفیع فرنگی محلی اور دوسرے حضرات بعد کو پہونچے۔ تدفین بعد مغرب مشہور گورستان عیش باغ کے نئے چمن میں ہوئی۔ شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی، تیسرے پہر نامہ سیاہ اپنی عمر میں پہلی بار اُترا۔ اور جس نے عمر بھر ان کے بہن ہونے کے حقوق ادا کیے تھے اور نہ سن میں بڑے ہونے کے، اُس نے عالم ناسوت کی یہ آخری خدمت اپنے ہاتھ سے انجام دی! —— سن میں بڑی تھیں مگر ساری عمر اپنے کو چھوٹا بنا کر رکھا تھا۔ آج اپنے پروردگار کے حضور میں ان شاء اللہ ہر طرح بڑائیوں سے سرفراز ہو رہی ہوں گی!

ماں کی خالص، بے غرض و بے لوث محبت کا اگر کہیں نشان ملتا ہے تو بہن ہی کی ذات میں۔ ہر بہن رکھنے والا اس کا تجربہ رکھتا ہے۔ اللہ نے آج وہ نعمت واپس لے لی، نعمت کا حق اتنے دنوں کب ادا ہوا تھا، جو اب کبھی آئندہ اس کی امیدیں قائم کی جائیں —— ہمشیر کی رخصتی ایک شادی کے وقت ہوتی ہے اور

ایک یہ - وہ مجاز ، اور یہ حقیقت !

عقلاً صبر کیا معنی، تسلیم و رضا داخل ایمان ہے - لیکن طبعی حُزن و غم پر بس نہیں، زندگی میں جو مستقل خلا پیدا ہوگیا ہے، وہ زندگی بھر کے لیے ہے صدق کے پڑھنے والے بھائی اور بہن اگر کوئی ہمدردی محسوس کریں تو بجائے تعزیت نامہ پر وقت صرف کرنے کے، وہیں اپنی جگہ دعائے خیر فرمائیں اور اگر ہوسکے، تو کچھ قرآن پاک جس قدر بھی آسانی سے پڑھ سکیں، مرحومہ کو بخشدیں -
غم از طبعی غم میں، غم آفریں نے لذت بھی بلا کی رکھ دی! اور قلب کی قسادت کا تو اس غم سے بڑھ کر کوئی علاج ہی نہیں، کاش اسی کے اثرات میں پائداری ہوتی! ـــــــــ عجب شان حکمت ہے، اور جمال میں کمال، کہ نعمت دیتے ہیں تو ہنسا کر اور عارضی طور پر واپس لیتے ہیں تو رُلا کر!
جسم کی لذت **اُس** میں، روح کی حلاوت **اِس** میں!

ایک قوال[1]

دریاباد۔ ۳ فروری ۱۹۴۶ء دوپہر۔ میت کو دفن کئے ابھی چلا آرہا ہوں۔ کل دن میں جاکر نزع کی حالت میں آبِ زمزم بھی تو پلایا تھا۔ مرنے والے کا نام افضل حسین تھا عمر ستر سال سے کچھ اوپر۔ پیشہ یا "ذات" کے لحاظ سے قوال تھے۔ —— قوال کا ذکر اور صدق کے صفحات میں! —— جی ہاں، "صدق عالموں، زاہدوں عابدوں کا پرچہ کب ہے؟ نامہ سیاہ صدق نویس تو خود ہی ایک عامی اور عاصی ہے۔ اپنے ہم جنسوں کا ذکر چُن چُن کر کیا ہی کرتا ہے —— ہاں تو اپنی جوانی کے زمانہ میں نامور قوالوں میں تھے، ردولی کی چوکی کا شمار چوٹی کی چوکیوں میں تھا۔ آواز میں ایک خاص گداز، درد و اثر تھا۔ اب مدت سے نماز اور تلاوت کے شدت سے پابند تھے۔ نماز بڑے اہتمام سے اور دل لگا کر پڑھتے۔ قرآن مجید کے کئی ایک پارے اِس سن میں حفظ کر لیے تھے۔ لکھنؤ میں کچھ دن جم کر رہنے کا موقع ملا، تو مدرسہ فرقانیہ والوں کے پاس بیٹھ کر کچھ تجوید بھی حاصل کرلی تھی۔ اذان بڑے شوق کے ساتھ اور موثر لہجہ میں دیا کرتے۔

---

[1] صدق ۱۳ فروری ۱۹۴۶ء

بڑے پُرانے ہم نشین تھے۔ روزانہ سہ پہر کو آتے، بیٹھنے کا معمول ۲۴۔۲۵ سال سے تھا۔ مساجت اور علم مجلس کا سلیقہ تھا۔ جب بیشہ میں تھے، بار ہا دل کو گرمایا تھا تڑپایا تھا ــــ اس راقم آثم نے برسوں سماع سنا ہے ــــ محفل کے باہر جتنا اپنے لطیفوں سے ہنساتے تھے، محفل کے اندر اُسی قدر اپنے پُراثر ترنم سے رُلاتے تھے۔ نزع کے وقت جب قبلہ رُخ چہرہ کرب سے کھنچ رہا تھا اور زیر لب اللہ اللہ جاری تھا۔ تو عبرت کی آنکھ روئی اور زبان نے دیکھنے والوں سے کہا "یہ وہی شگفتہ چہرہ ہے جو گھنٹوں ہنستا ہنساتا رہتا تھا" ــــ زندگی کا آغاز تمام تر فسق کی غفلتوں سے ہوا، خاتمہ رسول کی محبت اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دل میں آخری ارمان حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کا تھا ــــ صحبت و رفاقت کا حق بڑا حق ہوتا ہے۔ نماز جنازہ پڑھانے جب ایک آوارہ و ناکارہ کھڑا ہوا، تو خدائے آمرزگار کے حضور میں دعا دل سے نکلی کہ "اے مغفرت و رحمت پر حریص مالک و مولا، تیرے دربار میں ایک بڈھا نمازی حاضر ہو رہا ہے"!

جشنِ نوشابہ

لکھنؤ ۲۹۔ مارچ۔ جمعہ۔ ۷ بجے صبح۔ مرشد آباد بلیس (دفترِ حق و صدق) کی نق
ودق بارہ دری میں اس وقت یہ چہل پہل کیسی ہے؟ چہل پہل ماتمی رنگ کی، جسے دیکھئے
روئے دیتا ہے، رو ہی رہا ہے۔ ہنسنا مسکرانا جیسے بھول ہی گئے ہیں، گھر اندر باہر
بھرا ہوا ہے، اپنے بھی بیگانے بھی، بوڑھے بھی، بچے بھی، عوام بھی، خواص بھی، پر یہ ہو
کیا کہ ہر آنکھ میں آنسو، ہر لب پر آہ و فغاں! یہ حق والے عباسی صاحب تو بڑے ہنس
مکھ، صابر و ضابط تھے، انھیں کیا ہو گیا کہ خود چیخ چیخ کر رو رہے ہیں، اور دوسروں
کو بے اختیار رُلا رہے ہیں اور یہ ان کے بڑے بھائی تو شاید ان سے بھی بڑھ کر
خوش مزاج تھے اور کہیں باہر بہت دور ملازم۔ یک بیک یہ کیسے آ گئے؟ روتے جاتے
ہیں اور شاید زیرِ لب کچھ پڑھتے بھی جاتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی پردہ نشین بیویاں، ان
کی تو آواز تک کا پردہ تھا، یہ ہے کیا کہ بے اختیار سب باہر کی طرف ٹوٹی پڑتی ہیں،
ساری رات یک لخت رو رو کر کاٹی ہے۔ کل دن ہی سے رو رہی ہیں، جمعرات کی دوپہر

لہ صدق، ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء

سے جمعہ کی صبح کا وقت آگیا مسلسل اور بے ساختہ ایک عالم رونے پیٹنے کا ہے! کس نے اس مدت میں کھانے پینے کا نام اس گھر میں جانا ہے! اسا منے دیکھئے نا، دیوان خانہ میں اُجلی شفاف چادروں میں لپٹی ہوئی، تازی نہائی ہوئی، کافور اور عطر کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی، گھر بھر کی مینا، ننھی نوشابہ، پلنگڑی پر لیٹی ہوئی ہے! اچھا، تو یہ جشن نوشابہ ہے، وہ پُرانا جشن مسرت نہیں، مجلس ماتم، نوحۂ غم اور نغمۂ مسرت کے درمیان فرق ہی کیا ہے؟

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

سنا تھا کہ ماں باپ کو اپنی اس گڑیا کی شادی رچانے کا بڑا ارمان ہے. ارمان کسے نہیں ہوتا؟ یہاں تو اولاد کے داغ پر داغ اُٹھانے کے بعد سات آٹھ اولادوں کو خاک میں سلانے کے بعد یہی ایک زندہ سلامت بچی تھی۔ سات لڑکوں سے بڑھ کر یہ ایک لڑکی عزیز، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، گھر بھر کی اُمیدوں کا مرکز، لڑکا بھی گھر ہی میں موجود، کہیں لے جانا نہیں۔ بھائی کی اولاد بھی اپنی ہی اولاد ہوتی ہے، تو کہیں لڑکی کی رخصتی ہی تو نہیں ہو رہی ہے؟ بارہ برس کا سن، شادی کا سن تو نہیں ہوتا، لیکن عجب کیا جو ارمان کے مارے ہوئے ماں باپ نے اس سن میں شادی اور رخصتی ٹھہرالی ہو! بیشک نوشابہ رخصت ہو رہی ہے۔ پھاٹک پر سیاہ رنگ کی لاری بھی تو لگی ہوئی ہے۔ رخصت وہاں کے لیے ہو رہی ہے جہاں جاکر پھر کوئی اپنے میکے کے گھروندے میں واپس نہیں ہوتا۔ معصوم نے کل ہی اپنی بہنوں سہیلیوں سے کہا بھی تو تھا کہ "اب ہم اپنے گھر جا رہے ہیں، ہمارا کہا سنا معاف کرنا، وہ دیکھو سفید موٹر کھڑے ہوئے ہیں، بچوں کا انکشاف بہت قوی ہوتا ہے۔ عجب کیا جو برزخ کا انکشاف قبل سے ہو گیا ۔۔۔۔ تو کیا ہنستی، کھیلتی، بھولی بھالی نیک سیرت و مقبول صورت،

محلّہ کے غریبوں کو پیسے بانٹنے والی۔ پڑوسیوں کے دل میں جگہ رکھنے والی دنیا سے رخصت ہوگئی؟ کل دوپہر کو اسی طرح کا فقرہ حسرت نصیب باپ کی زبان سے سنا بھی تھا، کسی آنے والے عزیز کو خبر دے رہے تھے۔ پلی پلائی ١٢ برس کی اکلوتی کے لیے مرتے کا لفظ اُن کی زبان سے نکلا کیوں کر؟ ادائے تلفظ پر قدرت زبان کو کیسے ہوئی؟ اندر پردہ نشین غمزدہ ماں! لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں رہی ہیں۔ محض سکتہ کا عالم طاری ہے، بیشک آنسو سب خشک ہوگئے ہوں گے، لیکن کلیجہ کی کھرچن کر کیا کر رہی ہوں گی؟ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینے میں اُٹھتی ہوگی، اُس کا کیا علاج ہے؟ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں۔ آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ہوئے اُجڑتے ہوئے دیکھ کر خود زندہ کیسے رہیں! ہوش و حواس پر قابو رکھنے کی قوت دیتو ا! الٰہی کس نے دے دی؟ کڑے کڑے امتحان تو اللہ والوں کے دربار میں پیمبروں کے اور خاص خاص برگزیدہ بندوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کیا ان عاجز و ناتواں بندوں بندیوں کو بھی اُسی مرتبہ پر پہونچانا منظور ہے؟ دردِ دل کا بھی مرشد آباد ہیں کے اگر اس وقت دور بے ہوں تو حیرت نہ کیجیے، اس سے بڑھ کر پُراثر درد انگیز منظر اُس نے کب دیکھا ہوگا؟

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

"سوئے مدفن" کہاں کے لیے جا رہے ہیں؟ لڑکی کے یہ دن کیسے کیا نے کے تھے، دولہن بننے کے تھے، گڑیا گڈے کے بیاہ رچانے کے تھے! "سوئے مدفن" لے جانے کے؟ لیکن شور و شیون کے ہنگامہ میں ذرا کان لگا کر سنئے تو، غسل دینے والیوں کا بیان تھا کہ غسل والی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، عجب نہیں جو ہنس ہنس کر کچھ کہہ بھی رہی ہو۔ دل کے کانوں سے سنئے، صدا کچھ اس طرح کی آرہی ہے، "میری امی کا رونا،

بلکنا سب آپ کے حق میں رحمت ہو رہا ہے، دنیا سے معصوم جا رہی ہوں، پھر آج جیسا دن۔ انوار اور رحمتوں کی وہ بارش کہ میں خود انھیں میں گم ہوئی جا رہی ہوں، اپنے پیارے ابّو کو دیکھ رہی تھی، کیا ہزار ڈیڑھ ہزار، روپیہ میرے دوا علاج میں صرف کر رہے تھے جیسے کہیں کے امیر کبیر ہیں، آخر میرے ہی لیے تو جوڑ بٹور کر رکھنے والے تھے میرے قرض سے سبکدوش ہو گئے، امانت اپنے مالک کو واپس پہونچ گئی، یہ جدائی کے دن ہی کتنے ہیں۔ اپنے آقا و سردار کی یاد میں کاٹ دیجیے، جنھوں نے اپنی ایک نہیں دو دو اور کنواری نہیں، بیاہی ہوئی جوان جوان صاحبزادیوں کو کفنایا، دفنایا، اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا، مٹی میں سلایا، اپنے مالک و مولیٰ کی سپردگی میں دیا۔ آپ کو تو انھیں کی کنیزی پر فخر ہے، انھیں سے سبق صبر کا بھی لیجیے، میرے لیے زیادہ نہ کڑھیے یہ چند روزہ پردے اور حجاب تو آپ ہی کی مصلحت کے لیے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کی بخشش کا ذریعہ اور وسیلہ بن رہی ہوں، دنیا میں آپ کی خدمت کر ہی کیا سکتی تھی، آپ کی شفقتوں کا بدلہ کسی درجہ میں بھی کہاں دے سکتی تھی، یہاں البتہ انشاء اللہ [illegible] آپ سے ملوں گی۔ بڑھ کر اور لپک کر آپ سے لپٹوں گی، مچلوں گی، آپ دونوں کی انگلی پکڑ کر جنت میں لے جاؤں گی، یہ وعدے سچّے کی زبان سے آپ کو پہونچ چکے ہیں اور سچے کے وعدے غلط نہیں ہوتے۔"

---

(۱۵)

یادِ غم[1]

دریاباد۔ ۱۳ راپریل ۱۹۴۶ء۔ والدۂ ماجدہ کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیے آج پورے پانچ سال انگریزی حساب سے ہوئے، اپریل ۱۹۴۱ء کی یہی ۱۳ ہی تو تھی (مرثیہ کے لیے ملاحظہ ہو صدق مورخہ ۲۸ راپریل ۱۹۴۱ء) تربت مسجد سے متصل ہے، مسجد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں حاضری ہر روز پانچ بار، بلکہ آمد و رفت ملا کر یوں کہیے کہ دس بار ہوتی رہتی ہے۔ پہلے ایصال ثواب و دعائے مغفرت کے بغیر گزر جانا ناممکن نہ تھا، اب کئی کئی وقت اس کی بھی نوبت نہیں آتی۔ پہلے محض مٹی کے ڈھیر کا نظارہ دل کو بیقرار کر دیتا تھا۔ اب آنسو مدت ہوئی خشک ہو چکے، غفلت انسان پر کس درجہ مسلط رہتی ہے! عبرت پذیری کی عمر کتنی مختصر ہوتی ہے! بڑے سے بڑے حادثے گذر جانے کے بعد یوں معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے کبھی گزرے ہی نہ تھے! ـــــ مرنا جیسے اوروں ہی کے لیے مقدر تھا! اور اپنے لیے تو سدا جیتے رہنا اور اسی طرح چلنا پھرنا، کھانا پینا، ہنسنا کھیلنا ہے!

---

[1] صدق ۲۴ راپریل ۱۹۴۶ء

مزار کے پائینتی ایک نیم کا درخت ہے، ہر سال اپنے موسم پر نئے پھول لاتا ہے، نئے سرے سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے، اب کی بھی اس وقت اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیسا سوکھا، بے رونق ٹھونٹھ ایسا کھڑا تھا۔ آج کیسا گلزار ہے، کیا مہک دے رہا ہے۔ نرم نرم ہلکی ہلکی ہری پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جا رہی ہیں، سفید سفید پھول کیسے خوشنما کھلے ہوئے ہیں۔ جیسے مردہ میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ اللہ اللہ نباتات کے لیے یہ سرفرازیاں اور انسان کی قسمت میں محرومی! بہاروں پر بہاریں گزرتی جائینگی اور یہاں دید و شنید کی حسرتیں حسرتیں ہی بنی رہیں گی؟

بہ ہر بہار گل از زیر گل بر آرد سر
گلے بر فت کہ نا ید بہ صد بہار دگر!

معاً گویا کسی نے شانہ جھنجھوڑ کر سوتے سے جگا دیا۔ خاک کے نادان پتلے، یہ کیا ہذیان سرائی ہے، جب مخلوق کے ارذلوں کے ساتھ یہ لطف و کرم ہے تو تو سب سے اشرف ہے، اپنے مالک کا خلیفہ ہے، تیرے لیے جو سرفرازیاں ہیں، آج وہ تیرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں۔ یہ عزیزوں کی جدائیاں، یہ دل کی بیقراریاں، یہ دنیا کے صدمے اور امتحانات۔ سب تیرے مرتبے ایک سے ایک بڑھانے والے ہیں۔ خواب کا صدمہ بھی کوئی صدمہ ہے۔ آناً فاناً آنکھ کھلی اور ختم۔ پھر یہ زندگی کا خواب تو اس خواب سے بھی کہیں زیادہ بے ثبات و بے بساط ہے تسکین مقصود ہے تو آخرت کے خیال کو تازہ رکھ اور دل کو فانیوں سے توڑ کر باقی سے جوڑے رکھ۔

نسیم بکڈپو لکھنؤ کے شائع کردہ چند ادبی کتب

(مکمل فہرست ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمائیں)

کتاب	مصنف	قیمت
اردو میں قصیدہ نگاری	ڈاکٹر ابومحمد سحر	Rs. 4/-
اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود (ج)	Rs. 6/-
اردو غزل کے پچاس سال	ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل	Rs. 7/50
انشائے ماجد اول ۔ دوم	عبدالماجد دریا بادی	Rs. 5/-, 5/50
اردو رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی	Rs. 12/-
افکار و مسائل	احتشام حسین رضوی	Rs. 4/-
فیض میر	پروفیسر مسعود حسن رضوی	Rs. 1/50
ایک تھا شاعر { شاد عارفی ۔ فن و شخصیت }	مرتبہ: مظفر حنفی	Rs. 12/-
شاد عظیم آبادی { کلام و شرح کلام }	مرتبہ: نقی احمد ارشاد	Rs. 8/-
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	Rs. 15/-
مرزا رسوا { حیات اور ناول نگاری }	ڈاکٹر آدم شیخ	Rs. 6/-
معرکۂ چکبست و شرر	امیر حسن نورانی	Rs. 6/75
ناول کیا ہے ؟	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	Rs. 3/50
ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	Rs. 3/-
گزشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر	Rs. 6/-
نگارستان	نیاز فتح پوری	Rs. 4/-